میں خوارج نہروان اور بعض میں یہود و نصاریٰ کے بدعت گزار مراد لیے گئے ہیں۔ یہ سب وہ لوگ ہیں جن کے اعمال گناہ اور جرائم پر مشتمل تھے جبکہ وہ خود اپنے آپ کو حق پر سمجھتے تھے۔

یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ آیت میں ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے "حبطت اعمالهم" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ عربی زبان میں "حبط" کے معروف معنی یہ ہیں کہ اونٹ یا کوئی اور جانور زیادہ یا زہریلی گھاس کھالے جس کے نتیجہ میں اس کا پیٹ پھول جائے اور وہ ہلاک ہوجائے۔ ظاہر سی بات ہے کہ ایسے اونٹ کا موٹا پا اس کی صحت کی علامت نہیں ہوتا بلکہ ایسی بیماری کی علامت ہوتا ہے جو موت کا سبب بن جاتی ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ بعض نادان لوگ اسے صحت اور طاقت کی علامت سمجھتے ہوں۔

بعض انسانوں کا بھی یہی انجام ہوتا ہے۔ وہ اپنی تمام تر توانائی اور کوشش کو اپنی ہلاکت اور بدبختی کی راہ میں بروئے کار لاتے ہیں اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ سعادت اور خوش نصیبی کی راہ پر چل رہے ہیں۔

چھٹی آیت میں توبۂ کامل کا ذکر کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ توبہ ان لوگوں کو نصیب ہوگی جو اولاً تو جہالت اور نادانی کی وجہ سے گناہ کرتے ہیں، وہ گناہ کے برے انجام اور اس کی سزا سے بے خبر ہوتے ہیں۔ ثانیاً جلد ہی وہ اپنے کئے پر پشیمان ہوجاتے ہیں اور اللہ کی بارگاہ میں رجوع کر لیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کے مستحق ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرماتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے:

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَأُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿١٧﴾

ظاہر سی بات ہے کہ یہاں جہالت سے مراد وہ جہالت نہیں ہے کہ انسان کو سرے سے اچھے اور برے کا علم ہی نہ ہو کیونکہ ایسی صورت میں برے عمل کو انجام دینے والا معذور ہوتا ہے بلکہ اس سے مراد نسبی جہالت ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان گناہ کو تو جانتا ہے لیکن اس کے برے انجام سے پوری طرح آگاہ نہیں ہوتا۔

بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ "يتوبون من قريب" سے مراد موت سے پہلے توبہ کر لینا ہے۔ حالانکہ لفظ ''قریب'' کا اس سے کوئی ربط معلوم نہیں ہوتا، اس لیے کہ ممکن ہے موت سے پہلے توبہ کرنے والا گناہ سے پچاس سال بعد توبہ کر رہا ہو۔ جو روایات ان مفسرین نے اپنے اس مؤقف کے حق میں بیان کی ہیں، وہ اس آیت کی تفسیر نہیں ہیں بلکہ ان سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ اگر انسان موت سے قبل بھی توبہ کر لے تو اس کی توبہ قبول ہوسکتی ہے۔

لیکن بعض دیگر مفسرین نے اس سے نزدیک کا زمانہ مراد لیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ جلد ہی اپنے برے کام سے پشیمان ہوکر اللہ کی طرف لوٹ آئے، اس لیے کہ مکمل توبہ وہ ہے جو گناہ کے اثرات کو مکمل طور پر انسان کی روح اور جان سے دھوڈالے اور ان کا ذرا اثر بھی دل میں باقی نہ رہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان جلد ہی (اس سے پہلے کہ گناہ کی جڑیں انسان کے وجود میں مضبوط ہوجائیں اور اس کی فطرت ثانیہ بن جائیں) اس سے پشیمان ہوجائے۔ بصورتِ دیگر گناہ کے اثرات انسان کے قلب و جان

میں باقی رہ جانے کے غالب امکانات موجود رہتے ہیں۔ پس کامل تو یہ وہی ہے جو جلد از جلد کی جائے۔ لغت اور عرف کے لحاظ سے یہی معنی لفظ ''قریب'' کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتے ہیں۔

ساتویں اور آخری آیت میں زکوٰۃ کا حکم اور اس کے آثار و نتائج کا ذکر کیا گیا ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً

یعنی ''مومنین سے زکوٰۃ وصول کرو۔''

آگے چل کر زکوٰۃ کے معنوی اور اخلاقی آثار کا ذکر کیا گیا ہے:

''آپ اس عمل سے ان کو پاک کریں گے اور ان کو نشوونما دیں گے۔''

تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا

واضح سی بات ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی انہیں دنیا پرستی اور بخل سے پاک کرتی ہے اور ان میں انسان دوستی، سخاوت اور دوسروں کے حقوق کی حفاظت جیسی اعلیٰ اخلاقی صفات ان کے اندر پیدا کرتی ہے۔

اس کے علاوہ معاشرے میں فقر و تنگدستی کے نتیجہ میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، وہ فریضہ زکوٰۃ کی ادائیگی سے برطرف ہو جاتی ہیں اور معاشرہ ان کے منفی اثرات سے پاک ہو جاتا ہے۔ پس زکوٰۃ نہ صرف رذائل اخلاقی کے خاتمہ کا سبب بنتی ہے بلکہ زکوٰۃ دینے والے کو فضائل اخلاقی سے آراستہ بھی کرتی ہے۔ یہ وہی حقیقت ہے جس پر ہم یہاں بحث کر رہے ہیں، یعنی اعمال نیک و بد کا فضائل و رذائل اخلاقی کی پرورش میں کردار!

یہی بات حجاب سے متعلق آیت میں ایک اور پیرائے میں بیان ہوئی ہے:

وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ؕ

''جب تم ان سے کوئی استعمال کی چیز مانگو تو پردے کے پیچھے سے مانگو۔ تمہارا یہ عمل تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے بہتر ہے۔'' (احزاب: ۵۳)

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عمل میں عفت کا لحاظ رکھنے سے پاکیزگی قلب حاصل ہوتی ہے اور اس کے برعکس ترک عفت انسان کے قلب و روح کی آلودگی کی وجہ بنتی ہے اور رذائل اخلاقی کی پیدائش کا سبب بنتی ہے۔

نتیجہ

مندرجہ بالا آیات کی تفسیر و تشریح کا مقصد اس بات کو واضح کرنا تھا کہ انسان کے اعمال اس کے اخلاق کی تشکیل میں اہم

کردار ادا کرتے ہیں۔ مندرجہ بالا بحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ خودسازی اور تزکیہ نفس کے لیے ہمیں اپنے اعمال پر کڑی نظر رکھنی چاہیے۔ اس لیے کہ برے اعمال کو مکرر انجام دینے سے ایک تو ان کے برا ہونے کا احساس ختم ہو جاتا ہے اور دوسرے یہ کہ انسان کی روح ان کی عادی ہو جاتی ہے اور بات یہاں تک جا پہنچتی ہے کہ انسان ان اعمال کے ارتکاب سے نہ صرف یہ کہ رنجیدہ نہیں ہوتا بلکہ اس پر فخر بھی کرنے لگتا ہے۔

اخلاق پر اعمال کا اثر احادیث کی روشنی میں

مندرجہ بالا آیات میں اخلاق پر اعمال کے اثر کے حوالہ سے جو حقائق بیان کیے گئے ہیں، احادیث میں بھی بڑی وضاحت کے ساتھ ان کا ذکر ہوا ہے۔

۱۔ ایک حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

مامن عبدالا وفی قلبه نکته بیضاء فاذا اذنب ذنبا خرج فی النکتة نکتة سوداء فان تاب ذهب ذلك السواد، وان تمادی فی الذنوب زاد ذلك السواد حتی یغطی البیاض، فاذاغطی البیاض لم یرجع صاحبه الی خیر ابدا، وهو قول الله عزوجل: کلابل ران علی قلوبهم ما کانوا یکسبون

''ہر انسان کے دل میں ایک روشن نکتہ ہوتا ہے۔ جب وہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو اس روشن نکتہ پر ایک سیاہ نکتہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کر لے تو وہ سیاہ نکتہ مٹ جاتا ہے۔ اگر وہ گناہوں کا مسلسل ارتکاب کرتا رہے تو یہ سیاہ نکتہ بھی پھیلتا جاتا ہے، یہاں تک کہ روشن نکتہ کو پوری طرح سے ڈھانپ لیتا ہے۔ پھر وہ شخص کبھی نیکی کی طرف واپس نہیں جا سکتا۔ یہ وہی بات ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ جس طرح وہ سوچتے ہیں، حقیقت میں اس طرح نہیں ہے بلکہ یہ ان کے اعمال ہیں جو زنگ کی طرح ان کے دلوں کو لگ گئے ہیں۔'' (اصولِ کافی، ۲: ۲۷۳)

یہ حدیث اس بات کی بخوبی نشاندہی کرتی ہے کہ جب انسان پے در پے گناہ کرتا رہے تو اس کا دل تاریک ہو جاتا ہے اور یہ تاریکی رذائل اخلاق کا سبب بنتی ہے اور انسان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ نیکی کی طرف واپسی کے راستے اس پر بند ہو جاتے ہیں۔

۲۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام، امام حسن علیہ السلام کے نام اپنے وصیت نامہ میں فرماتے ہیں:

ان الخیر عادة

''نیکی ایک عادت ہے۔'' (بحارالانوار ۷۴: ۲۳۲)

اسی مضمون پر مشتمل ایک حدیث نبویؐ میں ہے:

الخیر عادة والشر لجاجة

''نیکی عادت ہے اور شر لجاجت ہے۔'' (کنز العمال، حدیث: ۲۸۷۲۲)

ایک حدیث میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

احب لمن عود منکم نفسه عادة من الخیر ان یدوم علیها

''میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ اگر تم میں سے کسی نے کسی اچھی بات کو اپنایا ہے تو اس پر قائم رہے۔''

(بحار الانوار، ۹۹:۶۴)

ان احادیث سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ کسی اچھے یا برے عمل کو مکرر انجام دینے کے نتیجہ میں انسان کے نفس میں اس عمل کی عادت پختہ ہو جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر اچھے یا برے اعمال اچھے یا برے اخلاق کی پیدائش کا سبب ہوتے ہیں جبکہ اچھے یا برے اخلاق، اچھے یا برے اعمال کا باعث ہوتے ہیں۔

۳۔ حضرت علی علیہ السلام امام حسن علیہ السلام کے نام اپنے مشہور وصیت نامہ میں فرماتے ہیں:

وعود نفسك التصبر علی المکروه، ونعم الخلق التصبر فی الحق

''مشکلات کے مقابلہ میں اپنے اندر صبر کی عادت پیدا کرو، اس لیے کہ راہ حق میں صبر ایک عمدہ صفت ہے۔'' (نہج البلاغہ، مکتوب: ۳۱)

یہاں بھی ہم تکرارِ عمل کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی عادت اور صبر کے درمیان باہمی تعلق کو واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں۔

۴۔ گناہ سے توبہ کے بارے میں بہت سی احادیث میں آیا ہے کہ توبہ کرنے میں جلدی کرنی چاہیے اور توبہ میں تاخیر سے اجتناب کرنا چاہیے (ورنہ گناہ کے اثرات دل میں باقی رہ جائیں گے جو وقت گزرنے کے ساتھ ایک پختہ عادت کا موجب بن جاتے ہیں)۔

ایک حدیث میں امام محمد تقی علیہ السلام فرماتے ہیں:

تأخیر التوبة اغترار، وطول التسویف حیرة .... والاصرار علی الذنب امن لمکر الله

''توبہ میں تاخیر دھوکہ اور غفلت کا سبب بنتی ہے، ..... تاخیر کا طولانی ہو جانا حیرت و سرگردانی کا سبب بنتا ہے اور گناہ پر اصرار اللہ کی پکڑ سے غفلت کا باعث بنتا ہے۔'' (بحار الانوار، ۳۰:۶)

ایک اور حدیث نبویؐ میں توبہ کے بارے میں یہ خوبصورت تعبیر نظر آتی ہے:

من تاب، تاب الله علیه و امرت جوارحه ان تستر علیه، و بقاع الارض ان تکتم علیه و انسیت الحفظة ما کانت تکتب علیه

''جو اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرتا ہے اور اللہ کی طرف لوٹتا ہے، اللہ بھی اس کی طرف لوٹتا ہے، اس کے اعضاء و جوارح کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس کے گناہوں کو پوشیدہ رکھیں، زمین کے ان حصوں کو جن پر اس نے گناہ کیے تھے اور نامۂ اعمال لکھنے والے فرشتوں کو بھی یہی حکم دیا جاتا ہے کہ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے، اسے فراموش کر دیں۔'' (کنز العمال: ۷۹)

اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ توبہ گناہ کے اثرات کو محو کر کے قلب کی پاکیزگی اور تقدس کو بحال کر دیتی ہے۔ یہی بات مزید واضح طور پر حضرت علی علیہ السلام کی اس حدیث میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

التوبة تطهر القلوب و تغسل الذنوب

''توبہ قلب کو پاک کر دیتی ہے اور گناہوں کو دھو دیتی ہے۔'' (غرر الحکم: ۷۸۳۳)

اس سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ گناہ دل پر برے اثرات چھوڑ جاتا ہے جو بتدریج ایک باطنی کیفیت اور اخلاق میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ توبہ ان اثرات کو مٹا دیتی ہے اور ان کو ایک مستقل اخلاقی کیفیت میں تبدیل ہونے سے روک دیتی ہے۔

کئی اور احادیث میں بھی توبہ کو طہور قرار دیا گیا ہے جو کہ گناہ اور بری باطنی خصوصیات کی تشکیل کے باہمی ربط کی نشاندہی کرتا ہے۔ (بحار الانوار، ۶۹: ۱۲۱ اور ۹۱: ۱۳۳)

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی معروف پندرہ مناجات میں سے ایک تائبین کی مناجات ہے، اس مناجات میں ہے:

و امات قلبی عظیم جنایتی فاحیه بتوبة منك یا املی و بغیتی

''اے میرے رب! میرے بڑے بڑے گناہوں نے میرے دل کو مردہ کر دیا ہے، میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ تو توبہ کے ذریعے اسے زندہ کر دے، اے میری امید اور اے میری آرزو!''

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ گناہ انسان کی روح اور قلب کو آلودہ کر دیتا ہے اور تکرارِ گناہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قلب مردہ ہو جاتا ہے۔ توبہ دل کی زندگی اور روح کی نشاط کو بحال کرتی ہے۔

لہٰذا رہروانِ راہِ فضیلت اور سالکانِ الٰہی پر لازم ہے کہ فضائل اخلاقی کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے اچھے اور برے اعمال کے مثبت اور منفی اثرات پر کڑی نظر رکھیں اور اس بات کو یاد رکھیں کہ انسان کا ہر عمل اس کی روح اور اس کے قلب پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر اعمال اچھے اور پاکیزہ ہوں تو روح پر اچھے اور پاکیزہ اثرات مرتب ہوتے ہیں اور اگر اعمال برے اور ناپاک ہوں تو روح پر برے اور ناپاک اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

اخلاق اور خوراک کا باہمی تعلق

ممکن ہے کہ پہلی نظر میں بعض لوگوں کے لیے یہ بات باعثِ حیرت ہو کہ خوراک کس طرح اخلاق اور نفسی کیفیات پر اثر انداز ہو سکتی ہے؟ اس لیے کہ خوراک کا تعلق تو براہِ راست جسم سے ہے جبکہ اخلاق کا تعلق روح سے ہے۔لیکن اگر جسم اور روح کے باہمی تعلق پر غور کیا جائے تو یہ تعجب اور حیرت برطرف ہو جاتے ہیں۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ کسی نفسیاتی بحران یا شدید رنج وغم کی وجہ سے قلیل سی مدت میں انسان جسمانی طور پر کمزور ہو جاتا ہے، انسان کے بال سفید ہو جاتے ہیں، نظر کمزور ہو جاتی ہے اور ہاتھ پاؤں کی طاقت جواب دے جاتی ہے۔اس کے برعکس اچھی جسمانی کیفیت انسان کی روح پر مثبت اثرات مرتب کر کے اس کو شاداب اور بانشاط بنا دیتی ہے۔

زمانۂ قدیم سے اہل علم و دانش انسان کے اخلاق پر اس کی خوراک کے اثرات کے بارے میں غور وفکر کرتے رہے ہیں اور یہ باتیں لوگوں کی ثقافت کا حصہ بھی بن چکی تھیں کہ مثال کے طور پر خون پینے کو سنگدلی کا سبب سمجھا جاتا تھا اور وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ صحت مند عقل ایک صحت مند جسم میں ہی ہو سکتی ہے۔

قرآن آیات اور احادیث میں بھی اس حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔سورۂ مائدہ کی آیت ۴۱ میں یہودیوں کی ایک جماعت کے بارے میں، جو اسلام کے خلاف جاسوسی اور کتاب خدا میں تحریف کے مرتکب ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يُطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ ۚ

''یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ نے نہیں چاہا کہ ان کے دلوں کو پاک کرے۔''

اس کے فوراً بعد اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

سَمَّاعُونَ لِلْكَذِبِ أَكَّالُونَ لِلسُّحْتِ ۚ

''وہ آپ کی باتوں کو بہت زیادہ سنتے ہیں تا کہ انہیں جھٹلائیں اور بہت حرام خواری کرتے ہیں۔''

اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی یہ قلبی کیفیت آیات الٰہی کی تکذیب اور مسلسل حرام خوری کا نتیجہ تھی، اس لیے کہ اگر ان اوصاف کا "لم یرد الله ان یطهر قلوبهم" سے کوئی تعلق نہ ہو تو یہ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے انتہائی غیر معیاری گفتگو قرار پائے گی۔

یہاں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حرام خوری آئینہ دل کے تاریک ہو جانے، دل پر اخلاق رذیلہ کے اثر اور فضائل اخلاقی سے دوری کا سبب ہے۔

سورۂ مائدہ کی آیت ۹۱ میں اللہ تعالیٰ شراب اور جوئے کے بارے میں فرماتا ہے:

''شیطان شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی پیدا کرنا چاہتا ہے۔''

إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطٰنُ أَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ

اس میں کوئی شک نہیں کہ بغض وعداوت دو باطنی اور اخلاقی خصوصیات ہیں جن کا اس آیت میں شراب خواری کے ساتھ گہرا تعلق بیان کیا گیا ہے۔ یہاں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حرام خوراک کھانا اور شراب خواری دشمنی اور لڑائی، جھگڑے کی ایجاد میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

سورۂ مومنون، آیت ۵۱ میں ہے:

يٰٓأَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۖ

یعنی ''اے رسولو! پاکیزہ خوراک کھاؤ اور اعمالِ صالح انجام دیتے رہو۔''

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ پاکیزہ خوراک کھانے اور عمل صالح کے درمیان ایک تعلق ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مختلف قسم کی خوراکیں کھانے کے مختلف اخلاقی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ حلال اور پاکیزہ خوراک روح کو پاک کرتی ہے اور اعمالِ صالحہ کا سبب بنتی ہے جبکہ ناپاک اور حرام خوراک روح کی تاریکی اور برے اعمال کا سبب بنتی ہے۔

تفسیر روح البیان میں عمل صالح اور پاکیزہ خوراک کے باہمی تعلق کا ذکر کرنے کے بعد مندرجہ ذیل اشعار سے استدلال کیا گیا ہے: (ترجمہ اشعار از مترجم)

علم و حکمت زاید از لقمہ حلال
عشق و رقت آید از لقمہ حلال

(علم وحکمت کا سبب رزق حلال، عشق ورقت کا سبب رزق حلال)

لقمہ تخم ہا است و برش اندیشہ ہا
لقمہ بحرا گوہرش اندیشہ ہا

(رزق بیج، اس کا ثمر فکر وخیال، رزق بحر، اس کا گہر فکر وخیال)

ایک اور شعر میں کہا گیا ہے: (تفسیر روح البیان ۶:۸۸)

قطرہ باران توچون صاف نیست
گوہر دریائے تو شفاف نیست

(تیری بارش کے قطرے صاف نہیں ہیں، اس لیے تیرے سمندر کے موتی شفاف نہیں ہیں)

تفسیر اثناءعشری میں بھی اس آیت کے ذیل میں قلبی پاکیزگی اور اعمالِ صالحہ کے رزق حلال کے ساتھ تعلق کی طرف اشارہ کیا

گیا ہے۔

خوراک اوراخلاق کاتعلق احادیث کی روشنی میں

قرآن شریف میں اگر چہ اس تعلق کے بارے میں صرف چند اشارات پائے جاتے ہیں مگر احادیث میں یہ بات بہت تفصیل کے ساتھ نظر آتی ہے۔نمونے کے طور پر ہم ذیل میں چند احادیث بیان کرتے ہیں:

۱۔ متعدد احادیث میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ قبولیت دعا کی شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ رزقِ حرام سے اجتناب کیا جائے۔ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوااور کہنے لگا:

''یارسولؐ اللہ! میں چاہتا ہوں کہ میری دعا قبول ہو۔''

آپؐ نے فرمایا:

طهر ما كلك ولا تدخل بطنك الحرام

''اپنی خوراک پاکیزہ رکھواوراپنے پیٹ میں حرام داخل نہ کرو۔''(بحارالانوار، ۹۰:۳۷۳)

ایک اورحدیث میں یہی بات اس طرح بیان کی گئی ے:

من احب ان يستجاب دعائة فليطيب مطعمه و مكسبه

''جوشخص یہ چاہتا ہوں کہ اس کی دعا قبول ہو، وہ اپنی خوراک اور پیشہ پاکیزہ رکھے۔''(بحارالانوار، ۹۰:۳۷۲)

ایک حدیث میں امام جعفرصادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان الله لا يستجيب دعاء بظهر قلب قاس

''اللہ تعالیٰ اس شخص کی دعا قبول نہیں کرتا جو قساوت قلبی کا شکار ہو۔''(بحارالانوار ۹۰:۳۰۵)

ان سب احادیث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ناپاک اورحرام خوراک قساوت قلب کا سبب ہوتی ہے،اسی وجہ سے حرام خوار کی دعا مستجاب نہیں ہوتی۔یہاں سے روح ودل کی ناپاکی اوررزق حرام کا باہمی تعلق واضح ہوجاتا ہے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے عاشورا کے دن کوفہ کی سنگدل فوجوں کے سامنے خطبہ دینے کا ارادہ فرمایا مگر جب آپ نے خطبہ شروع کیا تو وہ خطبہ سننے پرآمادہ نہ ہوئے اورشوروغل کرنے لگے۔اس پرآپؑ نے فرمایا:

ملئت بطونكم من الحرام فطبع الله على قلوبكم

''چونکہ تمہارے پیٹ حرام سے بھرے ہوئے ہیں،لہٰذا اللہ نے تمہارے دلوں پر مہر لگادی ہے(اورتم

حقائق کا ادراک کرنے سے قاصر ہو)۔'' (**سخنان حسین علیہ السلام ابن علی علیہ السلام از مدینہ تا کربلا: ۲۳۲**)

۲۔ متعدد احادیث میں رزق حرام اور عبادات کی عدم قبولیت کے درمیان باہمی تعلق کو بیان کیا گیا ہے۔رسولؐ اللہ سے ایک حدیث میں آیا ہے:

من اکل لقمة حرام لن تقبل له صلوة اربعین لیلة، ولم تستجب له دعوة اربعین صباحاو کل لحم ینبته الحرام فالنار اولی به و ان اللقمة الواحدة تنبت اللحم

''جوشخص حرام کا ایک لقمہ کھائے گا، چالیس روز تک اس کی نماز قبول نہ ہوگی، چالیس روز تک اس کی دعا مستجاب نہ ہوگی، رزق حرام سے جو گوشت اس کے جسم پر پیدا ہو، وہ جہنم کے لیے زیادہ موزوں ہے اور ایک لقمہ بھی گوشت کی پیدائش میں موثر ہوتا ہے۔'' (سفینۃ البحار، ا، مادہ اکل)

ظاہر سی بات ہے کہ قبولیت نماز کی کئی شرائط ہیں جن میں حضور قلب اور پاکیزگی دل بھی شامل ہیں۔لیکن رزقِ حرام قلب کی پاکیزگی کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

۳۔ رسولؐ اللہ سے مروی متعدد احادیث میں ہے:

من ترك اللحم اربعین صباحاساء خلقه

''جوشخص چالیس روز گوشت نہ کھائے، وہ بداخلاق ہوجائے گا۔'' (وسائل الشیعہ، ۱۷: ۲۵)

اس حدیث سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ گوشت میں ایسے مواد موجود ہیں کہ اگر چالیس دن تک انسان ان سے دور رہے تو اس کا انسان کے اخلاق اور باطنی کیفیات پر یہ اثر ہوتا ہے کہ انسان بداخلاق ہوجاتا ہے۔

البتہ بعض احادیث میں گوشت کے زیادہ استعمال کی مذمت بھی کی گئی ہے لیکن زیادہ عرصہ تک گوشت کے ترک کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔

۴۔ بہت سی احادیث میں جو "**کتاب الاطعمہ والاشربہ**" میں بیان ہوئی ہیں، بعض غذاؤں اور اچھے یا برے اخلاق کے باہمی تعلق کا ذکر کیا گیا ہے۔ایک حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

علیکم بالزیت فانه یکشف المرة......ویحسن الخلق

''روغن (یعنی زیتون کا تیل یا کوئی اور تیل) استعمال کیا کرو۔۔۔۔۔۔ یہ صفراء کو ختم کرتا ہے اور اخلاق کو بہتر کرتا ہے۔'' (وسائل الشیعہ، ۱۷: ۲۵)

۵۔ ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

من سرہ ان یقل غیظه فلیاکل الحم الدراج

''جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اس کا غصہ کم ہو جائے تو وہ تیتر کا گوشت کھائے۔'' (فروع کافی، ۶: ۳۱۲)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خوراک، غصے اور حلم کے درمیان تعلق پایا جاتا ہے۔

۶۔ تفسیر عیاشی میں ایک مفصل روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خون کو کیوں حرام قرار دیا ہے، آپؑ فرماتے ہیں:

واما الدم فانه یورث الکلب و قسوة القلب و قلة الرافة والراحمة لا یومن ان یقتل ولده ووالدیه........

''اللہ تعالیٰ نے خون اس لیے حرام کیا ہے کہ یہ دیوانگی، سنگدلی اور رحمت کی کمی کا باعث ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ انسان اپنے بیٹے یا والدین کو قتل کر ڈالے۔'' (تفسیر برہان ۱: ۴۳۴ مستدرک الوسائل ۱۶۳:۱۴)

اسی حدیث کے ایک اور حصے میں آیا ہے،

و اما الخمر فانه حرمها لفعلها و فسادها وقال ان مدمن الخمر کعابد الوثن ویورث ارتعاشا ویذهب بنوره ویهدم مروته

''اور اللہ نے شراب کو اس کے منفی اثرات کی وجہ سے حرام قرار دیا ہے۔ عادی شراب خوار انسان بت پرست کی طرح ہو جاتا ہے۔ اس کے جسم میں لرزہ پیدا ہو جاتا ہے، اس کے چہرے کی نورانیت ختم ہو جاتی ہے اور اس کی مروت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔''

۷۔ متعدد احادیث میں انگور کھانے اور غم واندوہ کے برطرف ہونے کے باہمی تعلق کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

شکی نبی من الانبیاء الی الله عزوجل الغم فامره الله عزوجل بالکال العنب (کافی، ۶: ۳۵۱)

''ایک نبی نے اللہ تعالیٰ سے غم واندوہ کی شکایت کی، اللہ تعالیٰ نے انہیں انگور کھانے کا حکم دیا۔''

اس حدیث میں خوراک اور اخلاقیات کے باہمی تعلق پر مزید تاکید نظر آتی ہے۔

۸۔ کئی احادیث میں انار کھانے اور شیطانی وسوسوں کے خاتمے اور نورانیت قلب کے باہمی تعلق کو بیان کیا گیا ہے۔ ایک

حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

من اکل رمانه علی الریق انارت قلبه اربعین یوما

''جو شخص نہار منہ ایک انار کھائے، چالیس دن تک اس کا دل نورانی رہے گا۔'' (کافی، ۶:۳۵۱)

۹۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جعفر ابن ابی طالبؑ سے فرمایا:

یاجعفر کل السفرجل فانه یقوی القلب و یشجع الجبان

''اے جعفر! ''بہی'' کھایا کرو، یہ دل کو قوت دیتی ہے اور بزدلی کا خاتمہ کرتی ہے۔'' (کافی، ۶:۳۵۱)

۱۰۔ بعض احادیث میں ضرورت سے زیادہ کھانے اور سنگدلی، قساوت اور نصیحت کا اثر نہ ہونے کے باہمی تعلق کو بیان کیا گیا ہے۔ کتاب ''اعلام الدین'' میں ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا:

ایاکم وفضول المطعم فانه یسم القلب بالقسوة ویبطیء بالجوارح عن الطاعة ویصم الهمم عن سماع الموعظة

''ضرورت سے زائد کھانا کھانے سے اجتناب کرو کیونکہ یہ قساوت قلب، عبادت میں سستی و کاہلی کا سبب ہوتا ہے اور نصیحت سننے کے معاملہ میں کانوں کو بہرہ کر دیتا ہے۔''

بحارالانوار اور اہل سنت کی بعض روایات میں بھی یہی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی گئی ہے۔

(بحارالانوار، ۷۴:۱۸۲)

اس حدیث سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ضرورت سے زائد غذا کے تین منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس سے دل میں قساوت پیدا ہوتی ہے، انسان عبادات وفرائض کی انجام دہی میں سستی اور کاہلی کا شکار ہو جاتا ہے اور نصیحت کو سننے اور سمجھنے والی سماعت سے محروم ہو جاتا ہے۔

یہ حقیقت بآسانی محسوس کی جاسکتی ہے کہ جب انسان نے زیادہ اور ثقیل کھانا کھایا ہوتا ہے تو وہ عبادات کو بمشکل انجام دیتا ہے اور اس کی عبادت میں کوئی نشاط وسرور نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس اگر انسان نے کم اور سادہ کھانا کھایا ہو تو صبح کی اذان سے پہلے بیدار ہو جاتا ہے اور عبادت ومطالعہ کے لیے اس کی حالت بہت اچھی ہوتی ہے۔

اسی طرح یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچی ہوئی ہے کہ جب انسان روزہ رکھتا ہے تو اس کے دل میں رقت اور نرمی پیدا ہو جاتی ہے اور نصیحت کو قبول کرنے کے لیے بہتر آمادگی اس میں موجود ہوتی ہے۔ لیکن جب انسان کا پیٹ بھرا ہوا ہو تو اس وقت اس کا ذہن اور سوچ ٹھیک طرح سے کام نہیں کرتے اور وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ سے دور محسوس کرتا ہے۔

۱۱۔ احادیث میں شہد کھانے اور دل کی پاکیزگی کے باہمی ربط کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

(بحارالانوار، ٦٣: ٢٩٤)

العسل شفاء من کل داء ولاداء فیه یقل البلغم و یجلی القلب

''شہد تمام بیماریوں کے لیے شفا ہے اور خود اس میں کوئی بیماری نہیں ہے۔ وہ بلغم کو کم اور دل کو روشن کرتا ہے۔''

نتیجہ

مذکورہ بالا احادیث اور اس مضمون کی دیگر احادیث سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ غذا اور باطنی کیفیات اور اخلاقیات کے درمیان قریبی تعلق پایا جاتا ہے۔ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ خوراک اچھے یا برے اخلاق کی علت تامہ ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ مندرجہ بالا احادیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ خوراک اخلاق کی پاکیزگی کی راہ ہموار کرنے میں موثر کردار ادا کرتی ہے،حرام وحلال کے لحاظ سے بھی اور کمیت وکیفیت کے اعتبار سے بھی۔

موجودہ دور کے سائنسدانوں اور محققین کا کہنا بھی ہے کہ بہت سی اخلاقی کیفیات کا تعلق ان ہارمونز سے ہے جومختلف حالات میں ہمارے بدن میں پیدا ہوتے رہتے ہیں اوران کا ہماری خوراک سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔اسی لیے ان کا کہنا ہے کہ ہر جانور کے گوشت میں اس جانور کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ جولوگ یہ گوشت کھاتے ہیں،ان کے اندر بھی یہ خصوصیات پیدا ہوجاتی ہیں۔ درندوں کا گوشت انسان میں درندگی پیدا کرتا ہے،سور کا گوشت جنسی بے راہ روی کا باعث ہوتا ہے۔

اس طرح معنوی تعلق کے علاوہ خوراک اور اخلاقیات کے درمیان مادی اور طبیعی تعلق بھی پایا جاتا ہے جس سے انکار ممکن نہیں ہے۔حرام غذائیں دل کو تاریک کردیتی ہیں اوراخلاقی خوبیوں کو کمزور کردیتی ہیں۔

ہم اس بحث کو اس واقعہ کا ذکر کر کے ختم کرتے ہیں جسے مسعودی نے مروج الذہب میں بیان کیا ہے:

مسعودی،فضل بن ربیع سے روایت کرتا ہے کہ ایک دن شریک بن عبداللہ،عباسی خلیفہ مہدی کے پاس گیا۔مہدی نے اسے کہا کہ ان تین کاموں میں سے ایک کام تمہیں ہر حال میں کرنا پڑے گا: قاضی کا عہدہ قبول کر دیا میرے بیٹے کے استاد بن جاؤ یا ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔شریک نے ذرا سوچا اور کہا کہ تیسرا کام سب سے آسان ہے۔مہدی نے اسے روکا اور باورچی کوانواع و اقسام کے لذیذ کھانے تیار کرنے کو کہا۔ جب شریک اس لذیذ (اورحرام) کھانے سے فارغ ہوا تو باورچی نے مہدی کی طرف منہ کر کے کہا:

''یہ کھانا کھانے کے بعد یہ شخص کبھی فلاح وسعادت کی خوشبو بھی نہ پاسکے گا۔''

اورایسا ہی ہوا۔اس کے بعد شریک نے قاضی کا عہدہ بھی قبول کرلیا اوراس کے بیٹے کو تعلیم دینے پر بھی آمادہ ہوگیا۔(مروج الذہب، ۳: ۳۱۰،سفینۃ البحار، مادہ شرک)

اخلاقی صفات اور اخلاقی اعمال

ہم یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ انسان کے اعمال اس کی اندرونی صفات کی بنیاد پر وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اندرونی صفات کی حیثیت جڑ کی سی ہوتی ہے جبکہ اعمال کی حیثیت شاخ اور پھل کی سی ہوتی ہے۔

اسی لیے اخلاقی صفات اور اخلاقی اعمال ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے، مثلاً نفاق جو صفاتِ رذیلہ میں سے ہے، انسان کے اندر اس کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں۔ یہ صفت انسان کے اندر خلافِ توحید، دوہری شخصیت کے وجود میں آنے کا سبب بنتی ہے اور یہی خصوصیت منافقانہ اور ریاکارانہ اعمال کی بنیادی وجہ ہوتی ہے۔

حسد ایک باطنی صفت ہے جس کی وجہ سے انسان کسی شخص سے اس لیے جلتا ہے کہ اللہ نے اسے کوئی نعمت عطا کر رکھی ہے۔ وہ اپنی اس کیفیت کا اظہار اپنے ان اعمال سے کرتا ہے جو وہ اس کی کامیابی کی راہ میں روڑے اٹکانے اور مشکلات پیدا کرنے کے لیے انجام دیتا ہے۔

تکبر اور غرور بھی وہ اندرونی صفات ہیں جو اس لیے انسان میں پیدا ہوجاتی ہیں کہ وہ اپنے مقام اور قدر و منزلت سے آشنا نہیں ہوتا یا پھر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے معاملہ میں کم ظرف ثابت ہوتا ہے۔ جب انسان دوسروں کی تحقیر اور تذلیل کرتا ہے تو درحقیقت وہ اپنی اسی صفت رذیلہ کا اظہار کر رہا ہوتا ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ علمائے علم اخلاق نے کتب اخلاق میں عام طور پر ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا ہے بلکہ کبھی وہ اسباب و وجوہات کا ذکر کرتے ہیں اور کبھی نتائج کا۔ اول الذکر کو اخلاقی صفات اور ثانی الذکر کو اخلاقی اعمال کا نام دیا جاتا ہے۔

البتہ اخلاقی اعمال علم فقہ کا موضوع ہیں اور فقہاء فقہی نقطہ نظر سے ان پر بحث کرتے ہیں۔ اس کے باوجود علمائے اخلاق ان کے بارے میں بھی گفتگو کرتے ہیں۔ البتہ علم اخلاق کے عالم اور فقیہ کے زاویۂ نگاہ میں فرق ہوتا ہے۔ فقیہ ان اعمال کے بارے میں وجوب، استحباب، کراہت اور اباحت کے حوالہ سے بات کرتا ہے اور کبھی ثواب وعقاب کے حوالہ سے ان افعال کا جائزہ لیتا ہے۔ لیکن علم اخلاق کا عالم ان افعال کا اس لحاظ سے مطالعہ کرتا ہے کہ یہ انسان کے روحانی کمال یا انحطاط کا مظہر ہیں۔

بارھواں باب

تہذیب اخلاق کی طرف عملی قدم

اس فصل میں ہم ان امور کو زیر بحث لائیں گے جو فضائل اخلاقی کی پرورش کیلئے زمین کو ہموار کرتے ہیں اور قدم بقدم انسان کو اللہ تعالیٰ کے قریب کرتے ہیں۔علم اخلاق میں اس بحث کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور اس میں بہت سے امور کے بارے میں بحث کی جاتی ہے۔

پہلا قدم توبہ

بہت سے علمائے اخلاق نے توبہ کو تہذیب اخلاق اور سیر الی اللہ کا پہلا قدم قرار دیا ہے۔ایسی توبہ جو صفحۂ قلب کو آلائشات سے پاک کردے،تاریکیوں کو روشنی سے بدل دے،انسان کی پشت سے گناہوں کا بوجھ اتار کر اسے ہلکا کر دے تاکہ وہ آسانی سے قرب الٰہی کا راستہ طے کر سکے۔

مرحوم فیض کاشانی محجۃ البیضا کی ساتویں جلد کے آغاز میں فرماتے ہیں:

''گناہ سے توبہ اور ستارالعیوب اور علام الغیوب کی بارگاہ کی طرف واپس آنا سالکین کے سفر کا نقطہ آغاز،فلاح پانے والوں کا سرمایہ،مریدانِ حق کا پہلا قدم،اہل محبت کی کلید،برگزیدگانِ الٰہی کیلئے صبح روشن کا طلوع اور مقربانِ الٰہی کا پسندیدہ عمل ہے۔''

اس کے بعد وہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انسان لغزشوں کا مرتکب ہوتا رہتا ہے اور حضرت آدمؑ کی لغزش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اس میں کیا مشکل ہے،سب فرزندانِ آدمؑ ارتکابِ خطا کے بعد حضرت آدمؑ کی پیروی کریں،اس لئے کہ صرف اعمالِ خیر کا صدور تو فرشتوں سے ہوسکتا ہے جبکہ برائی کی تلافی نہ کرنا شیاطین کی خصوصیت ہے اور شر کے بعد خیر کی طرف پلٹنا انسان کی طبیعت ہے۔جو شخص ارتکاب گناہ کے بعد خیر کی طرف واپس پلٹ آتے ہیں،وہی انسان ہیں۔

درحقیقت توبہ دین کی بنیاد ہے،اس لئے کہ دین انسان کو برائیوں سے دوری اور اعمالِ خیر کے قریب ہونے کی دعوت دیتا ہے۔اس حقیقت کے پیش نظر توبہ کو نجات بخش صفات واعمال کے ذکر میں مقام اول دیا جائے۔'' (محجۃ البیضا،۷:٦ تا۷)

بالفاظِ دیگر اکثر ہم دیکھتے ہیں کہ انسان،خاص طور پر سیر وسلوک الی اللہ کے آغاز میں،خطاؤں اور لغزشوں کا مرتکب ہوتا ہے۔اگر توبہ کے دروازے اس پر بند کردیئے جائیں تو وہ مایوس ہوکر قربِ الٰہی کے سفر کو ہمیشہ کیلئے ترک کردے۔اسی لئے اسلام کے تربیتی نظام میں توبہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور تمام گناہگاروں کو دعوت دی گئی ہے کہ اپنی اصلاح کیلئے اور ماضی کی تلافی کیلئے رحمتِ

الٰہی کے اس دروازے سے قربِ الٰہی کی طرف سفر کا آغاز کریں۔

اس حقیقت کو حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے مناجاتِ تائبین میں خوبصورت ترین پیرائے میں بیان کیا ہے:

الهی انت الذی فتحت لعبدك بابا الی عفوك سميته التوبة فقلت توبوا الی الله توبة نصوحا، فما عذر من اغفل دخول الباب بعد فتحه

اے میرے معبود! تو نے اپنے بندوں کیلئے اپنے عفو و درگزر کی طرف ایک دروازہ کھولا ہے جسے تو نے توبہ کا نام دیا ہے اور تو نے حکم دیا کہ اللہ کی طرف خالص توبہ کرو۔ اب جبکہ دروازہ کھلا ہے، کوئی اس دروازے سے نہ گزرے تو اس کے پاس کیا عذر باقی ہے!'' (بحارالانوار، ۹۴:۱۴۲، مفاتیح الجنان، مناجات التائبین)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی توبہ کو بہت پسند کرتا ہے، اس لئے کہ انسان کی ہر سعادت کا پہلا قدم توبہ ہے۔ ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان الله تعالی اشد فرحا بتوبة عبده من رجل اضل راحلته وزاده فی ليلة ظلماء فوجدها

اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ پر اس سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جتنا کوئی شخص دورانِ سفر، تاریک رات میں، بیابان میں اپنی سواری اور زادِ راہ کے گم ہو جانے کے بعد اس کے دوبارہ مل جانے پر خوش ہوتا ہے۔'' (اصولِ کافی، ۲:۴۳۵)

یہ بیان جو کہ بہت سے لطیف کنایات پر مشتمل ہے، اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ توبہ سواری بھی ہے اور زادِ راہ بھی، تاکہ انسان اس کے ذریعے گناہ کی تاریک وادی سے آگے گزر جائے اور نور و رحمت کی منزل اور اعلیٰ انسانی صفات تک پہنچ جائے۔

توبہ کی بحث کے ذیل میں بہت سے امور آتے ہیں جن میں سے زیادہ اہم یہ ہیں:

۱۔ حقیقتِ توبہ
۲۔ وجوبِ توبہ
۳۔ توبہ کی عمومیت
۴۔ ارکانِ توبہ
۵۔ توبہ کی قبولیت عقلی ہے یا نقلی
۶۔ جزئی توبہ
۷۔ توبہ کا دوام
۸۔ توبہ کے درجات
۹۔ توبہ کے نتائج و برکات

ا۔ حقیقت توبہ

اصل میں توبہ کے معنی ہیں گناہ سے واپس پلٹنا۔ یہ اس صورت میں ہے جب اس کی نسبت گنہگار شخص کی طرف دی گئی ہو۔ جیسے یہ کہا جائے کہ فلاں شخص نے شراب نوشی سے توبہ کر لی۔لیکن قرآن شریف اور احادیث میں متعدد مقامات پر اسے اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت دی گئی ہے۔اس صورت میں اس کے معنی رحمت کی طرف واپسی کے ہیں۔وہ رحمت جو گناہ کی وجہ سے سلب کر لی جاتی ہے، جب بندہ عبادت کی راہ پر واپس آتا ہے تو اللہ کی رحمت بھی اس کی طرف واپس ہو جاتی ہے۔اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ''تواب'' ہے جس کے معنی ہیں بہت زیادہ رحمت واپس بھیجنے والا یا بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا۔

درحقیقت توبہ کا لفظ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان مشترک معنوی یا مشترک لفظی ہے۔لیکن جب اسے بندوں کی طرف نسبت دی جاتی ہے تو اس کے ساتھ ''الیٰ'' استعمال ہوتا ہے اور جب اسے اللہ کی طرف نسبت دی جاتی ہے تو اس کے ساتھ ''علیٰ'' استعمال ہوتا ہے۔

محجۃ البیضاء میں توبہ کی حقیقت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ توبہ کے تین ارکان ہیں:علم، حال اور فعل۔ان تینوں میں سے ہر ایک دوسرے کی علت ہے۔

علم سے مراد گناہوں کے نقصانات کا علم ہے اور یہ کہ بندے کو اس بات کا علم ہو کہ گناہ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان حجاب بن جاتا ہے۔جب انسان کو اس حقیقت کا علم ہو جائے تو اس کا دل اس بات پر غمگین ہوتا ہے کہ وہ اپنے محبوب سے دور ہو گیا ہے۔چونکہ وہ یہ جانتا ہے کہ اس کے عمل کی وجہ سے یہ سب ہوا ہے تو وہ نادم اور پشیمان ہوتا ہے۔یہ ندامت ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں اس کے اندر ایک عزم اور ارادہ پیدا کرتی ہے۔

حال میں وہ اس عمل کو ترک کر دیتا ہے۔مستقبل کے بارے میں وہ عزم کرتا ہے کہ پھر اس عمل کو انجام نہ دے گا جو محبوب سے دوری کا سبب بنتا ہے اور ماضی کے حوالے سے وہ تلافی کی کوشش کرتا ہے۔

درحقیقت علم اور یقین کا نور انسان کے اندر وہ حالت پیدا کر دیتا ہے جو ندامت اور پشیمانی کا سرچشمہ بنتی ہے۔یہ ندامت ماضی، حال اور مستقبل کے لحاظ سے مذکورہ بالا تین اقدامات کا سبب بنتی ہے (محجۃ البیضاء)

یہ وہی حقیقت ہے جسے بعض اہل معرفت روحی انقلاب کا نام دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ توبہ انسان کی روح اور جان کے اندر پیدا ہونے والا انقلاب ہے جو انسان کو اپنی زندگی کے تمام معمولات میں نظر ثانی کی دعوت دیتا ہے۔

۲۔ وجوب توبہ

تمام علمائے اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ توبہ واجب ہے۔قرآن مجید میں بار بار توبہ کا حکم دیا گیا ہے، سورۂ تحریم، آیت ۸

میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ۭ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرو، خالص توبہ، امید ہے کہ اس طرح تمہارا رب تمہارے گناہوں کو معاف کر دے اور تمہیں جنت کے باغات میں داخل کرے جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔''

جب بھی اللہ تعالیٰ نے گمراہ اقوام کی ہدایت کے لیے کوئی نبی بھیجا تو ان کی تبلیغ کا پہلا قدم یہ تھا کہ انہوں نے توبہ کی طرف دعوت دی۔ اس لیے کہ توبہ اور دلوں کو گناہوں کے اثرات سے پاک کئے بغیر ممکن ہی نہیں کہ دل میں توحید اور اخلاقی فضائل کیلئے کوئی جگہ پیدا ہو سکے۔

حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم سے پہلی بات یہ کہی:

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ

''اے میری قوم! اللہ سے مغفرت طلب کرو پھر اس کی بارگاہ میں توبہ کرو۔'' (ہود: ۵۲)

یہی بات حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم سے اس طرح کہی:

فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ

''پس تم اس سے مغفرت طلب کرو اور اس کی طرف توبہ کرو۔'' (ہود: ٦١)

حضرت شعیبؑ نے بھی اپنی قوم کو دعوت کا آغاز اس دعوت سے کیا:

وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ۝۹۰

''پس تم اپنے رب سے مغفرت طلب کرو اور اس کی طرف توبہ کرو کیونکہ میرا رب بہت مہربان ہے اور (توبہ کرنے والوں) سے محبت کرتا ہے۔'' (ہود: ۹۰)

احادیث میں بھی گناہ کے بعد فوراً توبہ کرنے پر بہت تاکید کی گئی ہے۔

۱۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام حضرت امام حسن علیہ السلام کے نام اپنی وصیت میں فرماتے ہیں:

وان قارفت سيئة فعجل محوها بالتوبة (بحار الانوار ۲۰۸:۷۴، نهج البلاغه)

''اگر تم گناہ کے مرتکب ہو جاؤ تو جس قدر جلدی ممکن ہو اسے توبہ کے ذریعے مٹا دو۔''

اس حقیقت کے پیش نظر کہ امام سے گناہ سرزد نہیں ہوتا، یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس جملے کا مقصد عام لوگوں کو

نصیحت کرنا ہے۔

۲۔ ایک حدیث میں رسولؐ اللہ عبداللہ ابن مسعود سے فرماتے ہیں:

یابن مسعود لا تقدم الذنب ولا توخر التوبة، ولكن قدم التوبة و اخر الذنب

''گناہ کومقدم اورتوبہ کوموخر نہ سمجھو بلکہ توبہ کومقدم اور گناہ کوموخر رکھو۔''

۳۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

مسوف نفسه بالتوبة من هجوم الاجل على اعظم الخطر

''موت کے خطرہ کی موجودگی میں جوشخص توبہ میں تاخیر کرتا ہے، وہ سب سے بڑے خطرے سے دوچار ہے(کہ اس کی عمر تمام ہوجائے اوراس نے توبہ نہ کی ہو)۔''(مستدرک الوسائل ۱۲: ۱۳۰)

۴۔ ایک حدیث میں حضرت امام علی رضاؑ رسولؐ اللہ سے نقل فرماتے ہیں، (مستدرک الوسائل ۱۲: ۱۳۰)

ليس شيء احب الى الله من مومن تائب او مومنة تائبة

''توبہ کرنے والے مومن یا مومنہ سے بڑھ کر کوئی چیز اللہ کومحبوب نہیں ہے۔''

یہ عبارت توبہ کے وجوب کی دلیل ہوسکتی ہے، اس لئے کہ اس میں توبہ کواللہ کی محبوب ترین چیز کہا گیا ہے۔اس کے علاوہ توبہ کے وجوب پر بڑی واضح عقلی دلیل یہ ہے کہ یہ عقل کا فیصلہ ہے کہ عذاب الٰہی سے بچنے کی راہ ضرور تلاش کرنی چاہیئے، خواہ اللہ کا عذاب یقینی ہو یا احتمالی۔ چونکہ توبہ بہترین وسیلہ نجات ہے، عقل اسے واجب قرار دیتی ہے۔اگر گناہگار افراد توبہ نہ کریں تو وہ دنیا اورآخرت میں کس طرح اللہ کے عذاب سے بچ سکتے ہیں!

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ازروئے قرآن وحدیث وعقل توبہ واجب ہے اورتوبہ کے واجب ہونے پر تمام علمائے اسلام متفق ہیں۔بنابرایں ازروئے ادلہ اربعہ توبہ واجب ہے اوراس کا وجوب بھی فوری ہے، جیسا کہ ان چاروں دلائل سے واضح ہے۔

علم اصولِ فقہ میں بھی یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہوئی ہے کہ تمام اوامر ونواہی پر فوری عمل کرنا واجب ہے مگر یہ کہ دلیل سے ثابت ہو کہ فوریت ضروری نہیں ہے۔

۳۔توبہ کی عمومیت

توبہ کسی خاص گناہ، خاص فرد یا افراد، کسی خاص زمانے یا خاص عمر سے مخصوص نہیں ہے۔ ہرگناہ سے توبہ کرنا، ہرفرد پر اورہر زمان ومکان میں واجب ہے۔اگر توبہ میں قبولیت کی شرائط موجود ہوں تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں صرف ان لوگوں کی توبہ قبول نہ ہونے کا ذکر کیا گیا ہے جو عالم برزخ کی دہلیز پر پہنچ کر یا عذابِ خدا کو دیکھ کر توبہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔(جیسے فرعون،جس نے دریائے نیل کی موجوں میں غرق ہوتے وقت کہا کہ میں اب توبہ کرتا ہوں)۔

اس وقت توبہ کا دروازہ بند ہو چکا ہوتا ہے۔اس وقت کی توبہ مجبوری کی توبہ ہوتی ہے،اختیاری نہیں۔قرآن شریف میں ہے:

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْتَدْنَا لَھُمْ عَذَابًا اَلِـيْمًا ﴿١٨﴾

''ان لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوگی جو گناہ کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ انمیں سے کسی کی موت آجاتی ہےتو وہ کہتا ہے کہ اب میں نے توبہ کی،اسی طرح ان لوگوں کی توبہ بھی قابل قبول نہیں ہے جو حالت کفر پر مرجاتے ہیں۔ان کیلئے ہم نے دردناک عذاب تیار کررکھا ہے۔''(نساء:۱۸)

فرعون کے واقعہ میں ہے کہ جب وہ دریائے نیل میں بننے والے خشک راستے میں داخل ہوااوراچانک پانی کی لہروں نے اسے گھیر لیا تو اس نے کہا:

اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَاۗءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿٩٠﴾

''میں ایمان لایا کہ اس اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں مسلمین میں سے ہوں۔''(یونس:۹۰)

لیکن فوراً اس نے یہ جواب بھی سن لیا:

اٰۗلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٩١﴾

''اب ایمان لا رہے ہو؟ حالانکہ اس سے پہلے تم نے نافرمانی کی اورتم فساد کرنے والوں میں سے تھے (اب تیری توبہ قابل قبول نہیں ہے)۔''(یونس:۹۱)

بعض گزشتہ اقوام کے بارے میں قرآن شریف میں ہے:

فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَـنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ﴿٨٤﴾

''اب انہوں نے ہمارے عذاب کو دیکھا تو کہنے لگے ہم خدائے واحد پر ایمان لے آئے اور جن کو ہم اس کا شریک ٹھہراتے تھے،ان کا انکار کرتے ہیں۔''(مومن:۸۴)

قرآن شریف ان کے جواب میں کہہ رہا ہے:

فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَـنَا ۭ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿٨٥﴾ (مومن:۸۵)

''جب انہوں نے ہمارے عذاب کو دیکھا تو اس وقت ان کے ایمان نے ان کو کوئی فائدہ نہیں

دیا، یہ اللہ کی سنت ہے جو ہمیشہ اس کے بندوں میں جاری رہی ہے، یہی وہ موقع تھا جہاں کافروں نے خسارہ اٹھایا۔''

اسی اصول کی بنیاد پر اسلام کے عدالتی نظام میں یہ ایک قانون ہے کہ اگر کوئی مجرم گرفتار ہونے کے بعد توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی توبہ مجبوری کی توبہ ہوتی ہے جو انسان کے اندر کوئی مثبت تبدیلی نہیں لاتی۔

بنابرایں صرف ایک صورت میں توبہ قابل قبول نہیں ہوتی، وہ حالت جس میں انسان کے پاس کوئی اختیار باقی نہ رہے اور وہ توبہ کرنے پر مجبور ہو۔

بعض اہل علم کا خیال ہے کہ تین اور حالات میں بھی توبہ قبول نہیں ہے:

پہلی صورت شرک اور بت پرستی ہے۔قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ

''اللہ تعالیٰ شرک کو ہرگز معاف نہیں کرے گا، اس کے نچلے درجہ کے گناہوں کو، جس کیلئے چاہے معاف کردے گا۔'' (نساء:۴۸)

لیکن یہ نقطہ نظر صحیح نہیں ہے کیونکہ اس میں توبہ کی نہیں بلکہ توبہ کے بغیر بخشش کی نفی ہورہی ہے۔اس بات میں کوئی شک نہیں کہ صدرِ اسلام میں جن مشرکین نے اسلام قبول کیا تھا، ان کی توبہ قبول ہوئی تھی، اسی طرح اگر آج سارے مشرک توبہ کرلیں اور مسلمان ہوجائیں تو تمام علمائے اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ ان کی توبہ قبول ہوجائے گی لیکن اگر مشرک توبہ نہ کرے اور حالت شرک میں مر جائے تو اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور بخشش اس کے شامل حال نہ ہوگی۔لیکن اگر ایمان لے آئے اور پھر اس دنیا سے چلا جائے اور اس نے کچھ گناہ بھی کئے ہوں تو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمادے۔

یہی مذکورہ بالا آیت کا مفہوم ہے۔مختصر یہ کہ اللہ کی مغفرت اور بخشش مشرکوں کو نصیب نہیں ہوگی لیکن اہل ایمان کو نصیب ہوتی ہے۔لیکن توبہ تمام گناہوں، حتیٰ کہ شرک کی بھی بخشش کا سبب ہوجاتی ہے۔

دوسری اور تیسری صورت یہ ہے کہ توبہ گناہ کے تھوڑے عرصہ بعد کرلی جائے اور توبہ ان گناہوں سے ہو جو ازروئے جہالت کئے گئے ہوں، نہ کہ سرکشی و بغاوت کی وجہ سے، اس لئے کہ سورۂ نساء، آیت ۱۷ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷﴾

''توبہ صرف ان لوگوں کیلئے ہے جو ازروئے نادانی گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں اور پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں۔اللہ ان لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور اللہ علیم وحکیم ہے۔''

لیکن یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت میں توبہ سے مراد کامل توبہ ہے، اس لئے کہ اگر کوئی شخص سرکشی وعناد کی وجہ سے گناہ کرے اور پھر سرکشی وعناد سے باز آ جائے اور توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ بھی قبول فرماتا ہے۔

تاریخ اسلام میں ایسے بہت سے افراد کا تذکرہ ملتا ہے جو ابتداء میں اسلام کے سخت دشمن تھے مگر بعد میں توبہ کر کے مخلص مسلمان بن گئے۔ اسی طرح یہ بات بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ اگر انسان سالہا سال تک گناہ کرتا رہے اور بعد میں پشیمان ہو جائے اور حقیقی توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔

ایک حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی موت سے ایک سال قبل توبہ کر لے، اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔ پھر فرمایا کہ ایک سال زیادہ ہے، اگر موت سے ایک ماہ قبل بھی توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرما لیتا ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ ایک ماہ بھی زیادہ ہے، اگر کوئی شخص مرنے سے ایک جمعہ (یعنی ایک ہفتہ قبل) توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ ایک جمعہ بھی زیادہ ہے، اگر کوئی شخص مرنے سے ایک روز قبل توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ پھر فرمایا کہ ایک دن بھی زیادہ ہے، اگر کوئی شخص مرنے سے ایک ساعت قبل توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ ایک ساعت بھی زیادہ ہے، اگر کوئی شخص اس وقت توبہ کر لے جب اس کی جان اس کے گلے تک پہنچ جائے (یعنی حیات واختیار کے آخری لمحوں میں) تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول فرماتا ہے۔

البتہ اس کے معنی یہ ہیں کہ توبہ انہی تمام شرائط کے ساتھ انجام پائے، مثلاً اگر اس نے کسی کا حق ضائع کیا ہو تو وہ مرنے سے قبل اس کے حق کی ادائیگی کی وصیت کر کے توبہ کرے۔

قرآن شریف میں بہت سی آیات ہیں جو توبہ کی عمومیت پر دلالت کرتی ہیں جس کے معنی ہیں کہ تمام گناہوں میں توبہ کی گنجائش ہے:

۱۔ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾

''اے رسولؐ! کہہ دو کہ اے میرے بندو جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، یقیناً اللہ تمام گناہوں کو بخش دیتا ہے، بے شک وہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔'' (زمر: ۵۳)

۲۔ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۹﴾

''جو کوئی اپنے ظلم کے بعد توبہ اور اصلاح کر لے تو اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔ بے شک اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔'' (مائدہ: ۳۹)

۳۔ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْۗءًۢ ا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ ۙ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ

رَّحِيْمٌ﴿۵۴﴾

''تم میں سے جو کوئی از روئے نادانی گناہ کا مرتکب ہو، پھر توبہ اور اصلاح کر لے تو اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔'' (انعام: ۵۴)

اس آیت کے مفہوم میں اتنی وسعت ہے کہ سارے گناہ اس کے اندر آ جاتے ہیں اور آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ تمام گناہ قابل عفو ہیں۔

۴۔ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ڞ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ﴿۱۳۵﴾

''اور جب وہ گناہ کرتے ہیں یا اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں پر استغفار کرتے ہیں اور اللہ کے سوا کون گناہوں کو معاف کرتا ہے اور پھر وہ دانستہ اپنے گناہوں پر اصرار نہیں کرتے۔'' (آل عمران: ۱۳۵)

اس آیت میں بھی گناہ اور ظلم سے مراد تمام گناہ ہیں، اس لئے کہ بعض گناہ دوسروں پر ظلم کے زمرے میں آتے ہیں اور بعض گناہ اپنے اوپر ظلم محسوب ہوتے ہیں۔ اس آیت میں ان دونوں قسم کے گناہوں کی مغفرت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ آیت بھی توبہ کی عمومیت پر دلالت کرتی ہے۔

۵۔ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴿۳۱﴾

''اے اہل ایمان! تم سب اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرو، امید ہے کہ تم فلاح پاؤ گے۔'' (نور: ۳۱)

اس آیت میں ''جَمِيْعًا'' کا لفظ اس بات کی دلیل ہے کہ اس آیت میں ہر گناہ گار مسلمان کو توبہ کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر توبہ میں عمومیت نہ پائی جاتی تو اس طرح ہر گنہگار مسلمان کو توبہ کا حکم دینا صحیح نہ ہوتا۔

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں سے بعض میں اسراف، بعض میں ظلم اور بعض میں سوء کے الفاظ استعمال ہوئے اور توبہ کی صورت میں ان سب کی معافی کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں شیعہ وسنی کی کتب حدیث میں بہت سی احادیث پائی جاتی ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ توبہ کا دروازہ زندگی کے آخری لمحات کھلا رہتا ہے۔ ان احادیث کے مطالعہ کیلئے بحارالانوار، اصول کافی، درالمنثور، کنزالعمال، تفسیر فخر رازی، تفسیر قرطبی، تفسیر روح البیان، تفسیر روح المعانی اور دیگر کتب کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔ ممکن ہے اس حدیث کے متواتر ہونے کا دعویٰ بے جا نہ ہو۔

۴۔ ارکانِ توبہ

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ توبہ درحقیقت پشیمانی اور ندامت کی وجہ سے، اللہ کی نافرمانی سے اللہ کی اطاعت کی طرف واپس پلٹنے کا نام ہے۔ نیز یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ اس پشیمانی کا لازمہ یہ ہے کہ انسان کو اس بات کا علم حاصل ہو جائے کہ گناہ کی وجہ سے وہ اپنے محبوب حقیقی سے دور ہو گیا ہے، لہٰذا وہ اپنے گزشتہ برے عمل کو ترک کرنے کا پختہ عزم کر لے اور گناہوں کے نتیجہ میں رونما ہونے والی خرابیوں کی اصلاح کی کوشش کرے۔ اسی لئے قرآن مجید میں توبہ کے ساتھ اصلاح کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ مندرجہ ذیل آیات اس حقیقت کی بہترین دلیل ہیں:

۱۔ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾

اس آیت میں ان لوگوں کی مذمت کرنے اور سخت سزا کی وعید سنانے کے بعد جو آیات الٰہی کو چھپانے کے گناہِ کبیرہ کے مرتکب ہوئے، کہا جاتا ہے کہ:

''مگر وہ لوگ جو اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لیں اور جو کچھ انہوں نے چھپایا تھا، اسے بیان کریں تو ایسے لوگوں پر میں متوجہ ہو جاتا ہوں، اس لئے کہ اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔'' (بقرہ:۱۶۰)

۲۔ سورۂ آل عمران، آیت ۸۹ میں مرتد ہو جانے والوں اور ان کی سخت سزا کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے:

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۣ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾

''مگر وہ لوگ جو اس کے بعد توبہ کر لیں، اصلاح کریں، اس لئے کہ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔''

۳۔ سورۂ نساء کی آیت ۱۴۶ میں منافقوں اور ان کے برے انجام کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ

''سوائے ان لوگوں کے جو توبہ اور اصلاح کر لیں اور اللہ سے مضبوط تعلق قائم کریں اور اپنے دین کو اللہ کیلئے خالص کریں۔''

اسی طرح سورۂ نور کی آیت ۵ میں پاکدامن عورتوں پر بدچلنی کا الزام لگانے والوں کی سزا کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵﴾

''سوائے ان کے جو اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لیں۔ بے شک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔''

۵۔ سورۂ نحل کی آیت ۱۱۹ میں اللہ تعالیٰ ایک عمومی قانون کی حیثیت سے فرماتا ہے:

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۹﴾

''پھر تیرا رب ان لوگوں کے لیے بخشنے والا رحم کرنے والا ہے جو از روئے جہالت گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں، پھر اس کے بعد توبہ واصلاح کرتے ہیں۔''

۶۔ یہی بات سورۂ طٰہٰ کی آیت ۸۲ میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿۸۲﴾

''بے شک میں ان لوگوں کے لیے بہت بخشنے والا ہوں جنھوں نے توبہ کی اور ایمان لائے اور عمل صالح کرتے رہے، پھر ہدایت پا گئے۔''

اس آیت میں توبہ اور عمل صالح (یعنی ماضی کی خرابیوں کی اصلاح) کے علاوہ، جو کہ توبہ کے دو اساسی رکن ہیں، ایمان اور ہدایت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

درحقیقت گناہ ایمان کے نور کو کم کر دیتا ہے اور انسان کو ہدایت کی راہ سے منحرف کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ توبہ کے بعد گناہگار کو چاہیے کہ تجدید ایمان کرے اور راہِ ہدایت کی طرف واپس آ جائے۔

مندرجہ بالا آیات کی روشنی میں توبہ کے بارے میں قرآن مجید کی منطق مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے جس کی رو سے حقیقی توبہ کے لیے صرف استغفر اللہ کہنا، حتیٰ کہ ندامت اور گناہ کو مکمل طور پر ترک کر دینے کا عزم مصمم بھی کافی نہیں ہے بلکہ گناہ کی وجہ سے انسان کے اپنے قلب وجان اور معاشرے پر جو منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں، ان کی اصلاح کرنا بھی ضروری ہے۔

یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ مندرجہ بالا تمام آیات میں اصلاح کا لفظ اپنے وسیع ترین مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور ہر قسم کی خرابی اور فساد کی اصلاح پر دلالت کرتا ہے۔ اس کی رو سے:

۱۔ توبہ کرنے والے شخص پر لازم ہے کہ اس نے جس جس کا حق پامال یا ضائع کیا ہے، وہ انہیں واپس کرے۔ اگر صاحب حق فوت ہو چکا ہو تو اس کے وارث کو ادا کرے۔

۲۔ اگر اس نے غیبت یا کسی اور طریقہ سے کسی کی عزت کو داغدار کیا ہو تو اس سے معافی مانگے اور اگر وہ شخص فوت ہو چکا ہو تو اس کے لیے کارِخیر انجام دے تاکہ اس کی روح اس سے راضی ہو جائے۔

۳۔ اگر اس کی عبادات فوت ہو گئی ہوں تو ان کی قضا انجام دے۔ اگر کسی عبادت کے ترک کرنے کا شریعت نے کوئی کفارہ مقرر کیا ہے تو وہ کفارہ بھی ادا کرے۔

۴۔ چونکہ گناہ دل کو تاریک کر دیتا ہے، لہٰذا اس خرابی کی اصلاح کے لیے اس قدر عبادت کرے کہ نورانیت تاریکی پر غالب آ جائے۔

اصلاح کے بارے میں جامع ترین تعبیر امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے اس ارشاد میں نظر آتی ہے جو نہج البلاغہ میں کلمات قصار میں ہے۔ کسی شخص نے امیر المومنین علیہ السلام کی موجودگی میں کہا: ''استغفر اللہ''۔ گویا امام علیہ السلام اس کے گزشتہ کردار و اعمال سے آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ اس کی توبہ صرف لفظی توبہ ہے، نہ کہ حقیقی، لہٰذا آپؑ اس کی اس استغفار پر برہم ہوئے اور فرمایا:

''تیری ماں تجھے روئے! تجھے معلوم ہے استغفار کیا ہے؟ استغفار بلند مرتبہ لوگوں کا مقام ہے۔''

پھر آپؑ نے فرمایا:

''یہ ایک ایسا اسم ہے جو چھ معانی پر صادق آتا ہے:

اولها الندم علی ما مضی

''اول یہ کہ گزرے ہوئے برے اعمال پر انسان نادم اور پشیمان ہو۔''

والثانی العزم علی ترك العود الیه ابدا

''دوم یہ کہ اس کام کو ہمیشہ کے لیے ترک کر دینے کا عزم کرے۔''

والثالث ان توء دی الی المخلوقین حقوقهم حتی تلقی الله املس لیس علیك تبعة

''سوم یہ کہ لوگوں کے ضائع شدہ حقوق ان کو ادا کرے تا کہ قیامت کے دن کسی کا حق تمہارے ذمہ نہ ہو۔''

و الرابع ان یعمد الی کل فریضة علیك ضیعتها فتودی حقها

''چہارم یہ کہ جن فرائض کو تو نے ترک کیا ہے، انہیں انجام دے (ان کی قضا یا کفارہ انجام دے)۔''

والخامس ان یعمد الی اللحم الذی نبت علی السحت فتذیبه با الاحزان حتی تلصق الجلد بالعظم وینشا بینهما لحم جدید

''پنجم یہ کہ حرام خواری کے نتیجہ میں جو گوشت تمہارے بدن پر بنا ہے، گناہ پر پشیمانی اور غم کے ذریعے اسے پگھلا دو، یہاں تک کہ تمہاری کھال ہڈیوں سے چپک جائے، پھر اس پر نیا گوشت پیدا ہو۔''

والسادس ان تذیق الجسم الم الطاعة کما اذقته حلاوة المعصیة فعند ذلك

تقول استغفر الله

''ششم یہ کہ جس قدر تم نے گناہ کی لذت اور شیرینی کا لطف اٹھایا ہے، اب اسی قدر عبادت کی سختی کی تلخی کو برداشت کرو۔ جب یہ سب کچھ کرلوتو پھر کہو''استغفر اللہ''۔(نہج البلاغہ،کلماتِ قصار:۴۱۷)

یہی بات ایک اور روایت میں کمیل بن زیاد نے امیر المومنین علیہ السلام سے اس طرح نقل کی ہے کہ میں نے امیر المومنین علیہ السلام سے پوچھا:

يا امير المومنين العبد يصيب الذنب فيستغفر الله منه فما حد الاستغفار؟

''یاامیر المومنینؑ!انسان گناہ کا مرتکب ہوتا ہے، پھر استغفار کرتا ہے،استغفار کی حد کیا ہے؟''

امامؑ:''التوبہ''یعنی استغفار کی حد توبہ ہے۔

کمیل:''کیا اتنا ہی کافی ہے؟''

امامؑ:''نہیں۔''

کمیل:قلت فكيف؟''میں نے کہا، کیسے؟''

قال ان العبد اذا اصاب ذنبا يقول استغفر الله بالتحريك

''آپؑ نے فرمایا جب انسان گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو زبان کی حرکت سے استغفار کرتا ہے۔''

قلت وما التحريك

''میں نے کہا تحریک سے کیا مراد ہے؟''

قال: الشفتان واللسان يريد ان يتبع ذلك بالحقيقة

''آپؑ نے فرمایا: زبان اور لب گردش میں آتے ہیں اور اس سے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اس طرح حقیقت تک پہنچ سکے۔''

قلت وما الحقيقة؟

''میں نے عرض کیا: حقیقت کیا ہے؟''

قال تصديق في القلب واضمار ان لا يعود الى الذنب الذى استغفر منه

''آپ نے فرمایا:اس سے مراد سچائی کا وہ ادراک ہے جو گناہ کے بارے میں اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور وہ عزم کر لیتا ہے کہ جس گناہ سے اس نے استغفار کر لی ہے، اسے پھر کبھی انجام نہ دے گا۔''

فاذا فعل ذلك فانه من المستغفرين

''کیا جب وہ ایسا کر لے تو وہ مستغفرین میں شامل ہو جاتا ہے؟''

قال لا

''آپؑ نے فرمایا: نہیں!''

فکیف ذاك؟

''پس توبہ کی حقیقت کیا ہے؟''

لانك لم یبلغ الی الاصل بعده

''اس لیے کہ ابھی تک تم توبہ کی اساس تک نہیں پہنچ پائے ہو۔''

فاصل الاستغفار ماھو؟

''پھر استغفار کی اصل اور اساس کیا ہے؟''

الرجوع الی التوبة من الذنب الذی استغفرت منه وھی اول درجة العابدین

''جس گناہ سے استغفار کی ہے، اس سے توبہ کی طرف واپس آنا، یہ عابدین کا پہلا درجہ ہے۔''

پھر آپؑ نے فرمایا:

وترك الذنب والاستغفار اسم واقع لمعان ست

''ترک گناہ اور استغفار ایک ایسی حقیقت کا نام ہے جس کے چھ معنی و مراحل ہیں۔''

پھر آپؑ نے مختصر فرق کے ساتھ انہی چھ مراحل کا ذکر فرمایا جو نہج البلاغہ کے کلماتِ قصار سے ہم نقل کر چکے ہیں۔

(بحارالانوار، ٦:٢٧)

ممکن ہے یہاں پر یہ کہا جائے کہ اگر یہی توبہ ہے تو پھر شاید ہی کوئی شخص توبہ کر سکتا ہو!

اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس حقیقت کو ضرور مدنظر رکھنا چاہیے کہ مندرجہ بالا چھ مراحل توبۂ کامل کی شرائط ہیں، جیسا کہ پانچویں اور چھٹی شرط۔ جبکہ دیگر چار شرائط واجب اور لازم ہیں۔ بعض محققین نے ان مراحل کے بارے میں کہا ہے کہ پہلے دو مراحل توبہ کے ارکان ہیں، تیسرا اور چوتھا مرحلہ توبہ کی شرائط لازم ہیں جبکہ پانچواں اور چھٹا مرحلہ شرائط کمالِ توبہ ہیں۔ (گفتارِ معنوی، تالیف: شہید آیت اللہ مطہری: ۱۹۳)

ایک اور حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

اما علامة التائب فاربعة: النصیحة لله فی عمله، و ترك الباطل، ولزوم الحق، و

الحرص علی الخیر

''توبہ کرنے والے کی چار علامات ہیں:

۱۔اللہ کے بندوں کی خیرخواہی

۲۔ترک باطل

۳۔حق پر سختی سے کاربند رہنا

۴۔کارہائے خیر کوانجام دینے کی شدید خواہش (تحف العقول: ۳۲)

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ اگر انسان کا گناہ ایسا ہو جس کی وجہ سے اس نے کسی کو گمراہ کیا ہو، جیسے باطل کے حق میں تبلیغی مہم اور بدعت گزاری وغیرہ، تو اس کی اصلاح صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ جن افراد کو اس نے گمراہ کیا ہے، حتی الامکان انہیں راہِ راست پر لے کر آئے، ورنہ اس کی توبہ قبول نہ ہوگی۔

یہاں سے یہ بات واضح وآشکار ہو جاتی ہے کہ جو لوگ آیات الٰہی میں تحریف یا بدعت گزاری کے مرتکب ہوتے ہیں اور دوسروں کی گمراہی کا راستہ ہموار کرتے ہیں، ان کی توبہ کتنی سخت اور دشوار ہوتی ہے۔

اگر کوئی شخص بھرے مجمع میں ایسی تقریر کرے جس سے لوگ گمراہ ہو جائیں یا کتب ورسائل کے ذریعہ لوگوں کو گمراہ کر دے اور پھر تنہائی میں بیٹھ کر توبہ کرے تو ایسی توبہ ہرگز قابل قبول نہیں ہے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص سرعام کسی کی غیبت کرکے، اس پر تہمت لگا کر اس کی آبرو کو داغدار کر دے اور پھر اپنے گھر میں خلوت میں بیٹھ کر توبہ کرے تو اس کی توبہ بھی قبول نہیں ہوگی۔ ہاں! اگر وہ شخص، جس کی آبرو کو اس نے داغدار کیا ہے، اسے معاف کر دے تو پھر اور بات ہے یا پھر اسی طرح مجمع عام میں اپنی بات کو جھٹلائے، جس طرح اس نے مجمع عام میں غیبت کی تھی یا تہمت لگائی تھی۔

ایک معتبر حدیث میں ہے کہ کسی شخص نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ اگر کسی شخص پر حد جاری کی جائے، پھر وہ توبہ کر لے تو کیا اس کی گواہی قبول کی جاسکتی ہے؟

آپؑ نے فرمایا:

اذا تاب وتوبته ان یرجع مما قال ویکذب نفسه عند الامام وعند المسلمین، فاذا فعل فان علی الامام ان یقبل شهادته بعد ذلك

''ہاں! اگر وہ توبہ کر لے اور اس کی توبہ یہ ہے کہ جو کچھ اس نے کہا تھا، اسے واپس لے اور حاکم اور مسلمانوں کے سامنے اپنے آپ کو جھٹلائے تو پھر حاکم پر لازم ہو جاتا ہے کہ اس کی گواہی کو قبول کرے۔'' (وسائل الشیعہ ۱۸: ۲۸۳)

ایک اور حدیث میں ہے:

اوحی اللہ عزوجل الی نبی من الانبیاء قل لفلان وعزتی لودعوتنی حتی تنقطع اوصالك، ما استجیب لك، حتی تردمن مات الی مادعوته الیه فیرجع عنه

''اللہ تعالیٰ نے ایک نبی کی طرف وحی کی کہ فلاں شخص سے کہو کہ اگر تو مجھے اس قدر پکارے کہ تیرے جوڑ الگ الگ ہو جائیں تو میری عزت کی قسم! میں تیری دعا پھر بھی قبول نہیں کروں گا جب تک کہ تو ان لوگوں کو زندہ کر کے اس گمراہی سے واپس نہ لے آئے جس پر تو نے انہیں ڈالا تھا۔''

(بحارالانوار ۶۹:۲۱۹)

اس حدیث سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اصلاح کا دائرہ کس قدر وسیع ہے اور اس کے بغیر توبہ صرف ظاہری توبہ ہوگی۔

یہاں پر اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ جو لوگ گناہوں کی کثرت کے باوجود زبانی استغفار پر قناعت کر لیتے ہیں اور اس کے ارکان وشرائط کو پورا نہیں کرتے، وہ اپنے آپ سے بھی اور توبہ واستغفار سے بھی مذاق کر رہے ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

التائب من الذنب کمن لاذنب له، و المقیم علی الذنب وهو مستغفر منه کالمستهزء

''جو شخص گناہ سے (کامل اور جامع الشرائط) توبہ کر لے، وہ اس شخص کی مانند ہوتا ہے جس نے کوئی گناہ نہیں کیا اور جو شخص گناہ پر قائم رہتے ہوئے استغفار کرتا ہے کہ گویا وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔''

(اصولِ کافی، ۲:۴۳۵)

۵۔قبولیت توبہ عقلی ہے یا نقلی

تمام علمائے اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر توبہ جامع الشرائط ہو تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ضرور قبول ہوتی ہے۔آیات وروایات سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے۔لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا توبہ کی قبولیت عقلی ہے یا نقلی؟

بعض علماء کا نظریہ ہے کہ توبہ کے بعد عذاب وسزا کا ٹل جانا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو توبہ کے باوجود بندے کو معاف نہ کرے۔

اس کے برعکس بعض علماء قائل ہیں کہ توبہ کے بعد عذاب اور سزا کا ٹل جانا واجب ہے اور توبہ کے باوجود مجرم کو معاف نہ کرنا

ایک ایسا ناپسندیدہ عمل ہے جس کا اللہ تعالیٰ کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔

ممکن ہے اس مقام پر ایک اور نظریئے کو قبول کر لیا جائے۔ وہ یہ کہ توبہ کی قبولیت ایک عقلی مسئلہ ہے۔ اگرچہ عقل، توبہ اور عذر خواہی کے قبول کرنے کو ضروری اور لازمی قرار نہیں دیتی مگر دنیا بھر کے عقلاء میں یہ طریقہ رائج ہے کہ اگر کوئی شخص کسی برے کام کا مرتکب ہونے کے بعد معافی مانگے اور اپنے برے کام کے تمام اثرات کو بھی مٹا دے اور ایسی حالت پیدا کر دے کہ گویا اس نے کوئی برا کام یا نقصان کیا ہی نہیں ہے، تو دنیا بھر کے عقلاء کی روش یہ ہے کہ وہ ایسے شخص کو معاف کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ایسی حالت میں معاف کرنے پر تیار نہ ہو تو اسے کینہ پرور اور انسانی حقوق سے عاری سمجھا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ، جو کہ ہر کسی اور ہر چیز سے بے نیاز ہے، وہ اس بات کے زیادہ لائق ہے کہ توبہ کرنے والے اور معافی مانگنے والے بندوں کی توبہ قبول کرے اور انہیں معاف فرمائے بلکہ ممکن ہے کہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر یہ کہا جائے کہ قبولیت توبہ عقلی ہے اور اس سلسلہ میں "قاعدہ قبیح نقض غرض" (یعنی مقصد شکنی فعل قبیح ہے) کو بنیاد بنایا جائے۔

اس کی وضاحت اس طرح کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی عبادات اور اطاعات سے بے نیاز ہے۔ جتنی عبادات بھی اس نے بندوں پر فرض کی ہیں، ان کا مقصد بندوں کی بہتری اور انہیں درجۂ کمال تک پہنچانا ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دیگر تمام واجبات کا مقصد ہمارا روحانی ارتقاء اور ہمیں اللہ کے قریب کرنا ہے۔

قرآن مجید میں نماز کو برائی اور بدکاری سے روکنے کا ذریعہ (عنکبوت: ۴۵)، روزہ کو تقویٰ کا سبب (بقرہ: ۱۸۳) اور زکوٰۃ کو فرد اور معاشرے کی پاکیزگی اور برتری کا وسیلہ (توبہ: ۱۰۳) کہا گیا ہے۔

احادیث میں بھی ایمان کو شرک سے پاکیزگی، نماز کو تکبر سے پاکیزگی، حج کو مسلمانوں کی وحدت اور جہاد کو مسلمانوں کی عزت و شوکت کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ (نہج البلاغہ، کلمات قصار: ۲۵۲)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ تمام فرائض انسان کی سعادت اور ارتقاء کے لیے مقرر کیے گئے ہیں تاکہ انسان ان کے ذریعے مقام عبودیت تک رسائی حاصل کر سکے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴿۵۶﴾ (ذاریات: ۵۶)

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ توبہ کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان کمال اور ارتقاء کی طرف اپنا سفر جاری رکھے۔ چونکہ انسان معصوم نہیں ہے، اس سے گناہ اور خطا کا سرزد ہونا انہونی بات نہیں ہے، لہٰذا اگر واپسی کا کوئی راستہ اس کے لیے کھلا نہ ہو تو وہ کمال اور ارتقاء سے محروم رہ جائے گا۔ لیکن اگر اسے بتا دیا جائے کہ گناہ اور خطا کی صورت میں توبہ کرو اور گناہ کے ذریعے جو خرابی تم نے پیدا کی ہے، اس کی تلافی کرو تو اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ قبول اور تمہارے گناہ معاف فرما دے گا۔ ایسی صورت میں انسان سعادت کے قریب تر اور انحراف و خطا سے دور ہوتا ہے۔

نتیجہ یہ کہ توبہ کو قبول نہ کرنا حصولِ مقصد کی راہ میں رکاوٹ اور سبب نقض غرض ہوگا۔ اس لیے کہ تمام فرائض کا مقصد انسان کی

سعادت ہے اور توبہ کی عدم قبولیت اس مقصد کے حصول کو ناممکن بنادے گی۔مختصر یہ کہ توبہ کا ایک فلسفہ ہے جو انسان کے کمال اور ارتقاء کے ساتھ قریبی تعلق رکھتا ہے۔اگر توبہ کا دروازہ بند ہوجائے تو کمال وارتقاء کا جذبہ مرجاتا ہے بلکہ انسان پستی کی طرف جا گرتا ہے، اس لیے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اب جبکہ اس کے پاس نجات کا کوئی راستہ موجود نہیں ہے تو پھر وہ گناہوں سے کیوں اجتناب کرے۔اسی لیے تمام انسانی مربی، خواہ کسی آسمانی دین پر ایمان رکھتے ہوں یا نہیں، اپنے زیر تربیت افراد پر واپسی اور توبہ کا دروازہ کھلا رکھتے ہیں تاکہ ان کے اندر کمال وارتقاء کا جذبہ سرد نہ ہو۔

اس طرح یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ اگر توبہ میں قبولیت کی شرائط پائی جاتی ہوں تو نہ صرف از روئے قرآن واحادیث بلکہ از روئے عقل بھی اس کی قبولیت ضروری اور ناقابل انکار ہے۔

۶۔جزئی توبہ

کیا یہ ممکن ہے کہ انسان بعض گناہوں سے توبہ کرلے اور بعض گناہوں کو انجام دیتا رہے؟ مثلاً ایک شخص جو شراب خواری بھی کرتا ہو اور غیبت بھی، یہ فیصلہ کرے کہ شراب خواری کو ہمیشہ کے لیے ترک کردے مگر غیبت کے بارے میں ایسا کوئی فیصلہ نہ کرے۔

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ توبہ سارے گناہوں سے ہونی چاہیے، اس لیے کہ گناہ کوئی بھی ہو، اس کے معنی اللہ کے حکم کی نافرمانی اور اس کی بارگاہ کی بے حرمتی ہے۔اگر کوئی شخص گناہ کے اس نتیجہ سے پشیمان ہو تو اسے چاہیے کہ وہ ہر گناہ کو ترک کردے، نہ یہ کہ بعض گناہوں کو ترک کردے اور بعض کو انجام دیتا رہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ جزئی توبہ بھی ممکن ہے۔علم اخلاق کے بعض بزرگ علماء جیسے مرحوم نراقی نے ''معراج السعادۃ'' میں اپنے والد بزرگوار سے اس نظریئے کو نقل کیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ممکن ہے انسان بعض گناہوں کے نتیجہ اور برے اثرات کے بارے میں زیادہ علم وآگہی حاصل کرلے اور ان سے توبہ کرلے مگر جن گناہوں کے بارے میں ایسی آگہی نہ رکھتا ہو، ان کو انجام دیتا رہے۔اگر غور سے دیکھا جائے تو اکثر توبہ کرنے والوں کی توبہ ایسی ہی ہوتی ہے۔اکثر لوگ کسی خاص گناہ سے توبہ کرلیتے ہیں اور ممکن ہے کہ کسی اور گناہ کے مرتکب ہوتے رہیں۔ہمیں کسی کتاب میں یہ نہیں ملتا کہ رسولؐ اللہ، آئمہ معصومینؑ یا بزرگانِ دین میں سے کسی نے ایسی توبہ کو غیر معتبر قرار دیا ہو اور اس بات پر زور دیا ہو کہ توبہ اسی صورت میں توبہ ہوگی جب تمام گناہوں سے توبہ کی جائے۔

قرآن مجید کی بعض آیات سے بھی جزئی توبہ کے صحیح ہونے کی تائید ہوتی ہے، مثلاً رباخواروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

''اگر تم توبہ کرلو (تو تمہاری توبہ قبول ہوگی) اور تمہارا سرمایہ تمہارا۔'' (بقرہ:۲۷۹)

مرتد ہونے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿٨٧﴾ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ﴿٨٨﴾ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٨٩﴾

''ان لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ، فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہے، وہ ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے، ان پر سے عذاب ہلکا بھی نہ ہونے پائے گا اور نہ ان کو مہلت ہی دی جائے گی، سوائے ان لوگوں کے جو اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لیں۔ بے شک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔'' (آل عمران: ۸۷ تا ۸۹)

اللہ اور رسولؐ سے جنگ کرنے والوں اور معاشرے میں فساد برپا کرنے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَقْدِرُوا عَلَيْهِمْ ۖ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٣٤﴾

''اگر اس سے پہلے تم ان پر قابو پالو، وہ توبہ کر لیں تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔'' (مائدہ: ۳۴)

بدکاری کے مرتکب افراد کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَإِنْ تَابَا وَأَصْلَحَا فَأَعْرِضُوا عَنْهُمَا ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ تَوَّابًا رَحِيمًا ﴿١٦﴾

''مگر جو لوگ توبہ کر لیں، ایمان لائیں اور عمل صالح انجام دیں تو اللہ ان کی برائیوں کو نیکیوں سے بدل دے گا۔'' (نساء: ۱٦)

اگر چہ ان میں سے بعض آیات دنیوی سزا کے بارے میں ہیں اور ان سے معافی بھی توبہ کے ذریعے ہی ممکن ہے لیکن اس لحاظ سے کوئی فرق موجود نہیں ہے کہ اگر دنیوی سزا میں توبہ قبول ہو جائے تو یقیناً اخروی سزا کے بارے میں بھی قبول ہو جائے گی۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ گناہوں کے بارے میں آگہی اور ان کے محرکات کے مختلف ہونے کی وجہ سے جزئی توبہ کے قابل قبول ہونے میں کوئی مانع نہیں ہے۔ لیکن یہ بات بہرحال ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ مکمل توبہ وہی ہوتی ہے جو تمام گناہوں سے کی جائے، نہ کہ جزئی توبہ۔

۷۔ توبہ کی پائیداری

توبہ کو ہمیشہ پائیدار ہونا چاہیے۔ جب بھی انسان نفس امارہ کے وسوسوں کے زیر اثر کسی خطا کا مرتکب ہو تو اسے چاہیے کہ فوراً توبہ کرے اور ''نفس لوامہ'' کے مرحلہ میں داخل ہو جائے۔ اسے اس سلسلہ میں آگے بڑھتے رہنا چاہیے، یہاں تک کہ وہ ''نفس مطمئنہ''

کے مقام پر فائز ہو جائے اور وسوسہ کی جڑیں کٹ جائیں۔

دوسری طرف انسان پر یہ بھی لازم ہے کہ جب وہ کسی گناہ سے توبہ کرے تو خوب احتیاط کرے کہ اپنی توبہ پر قائم رہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے ہوئے ترکِ گناہ کے عہد پر ثابت قدم اور پائیدار رہے۔ لہٰذا اگر توبہ کے بعد اس گناہ کا رجحان اس کے اندر باقی رہ جائے تو اسے چاہیے کہ اس کے خلاف جہاد میں مشغول ہو جائے۔ یہی وہ جہاد ہے جسے جہاد بالنفس یا جہادِ اکبر بھی کہا جاتا ہے۔ ایسا کرنے کی صورت میں وہ تائبین کے ساتھ ساتھ مجاہدین کی صف میں بھی شامل ہو جائے گا۔

اس مقام پر بعض علمائے اخلاق نے یہ بے نتیجہ یا کم نتیجہ بحث بھی کی ہے کہ آیا وہ توبہ کرنے والا افضل ہے جو توبہ کرنے کے ساتھ ساتھ گناہ کی خواہش کے خلاف جہاد بھی کرتا ہے یا وہ توبہ کرنے والا جس نے توبہ کے ساتھ گناہ کی خواہش کو ختم کر ڈالا ہو۔

یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ ان دو قسم کی توبہ کاروں میں سے کون افضل ہے! اہم بات یہ ہے کہ توبہ کرنے والا کیا طریقہ کار اپناتا ہے کہ وہ گناہ کی طرف واپس نہ جائے۔ اس مقصد کے لیے مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

۱۔ گناہ کے ماحول اور گناہ کی محافل سے دور رہنا، اس لیے کہ آغاز میں توبہ کمزور ہوتی ہے اور تائب کی حالت اس بیمار جیسی ہوتی ہے جو حال ہی میں کسی بیماری سے صحت یاب ہوا ہو اور اگر وہ دوبارہ ایسے ماحول میں جائے جہاں بیماری کے جراثیم پائے جاتے ہوں تو اس کے دوبارہ بیمار ہو جانے کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

۲۔ تائب پر لازم ہے کہ اپنے دوستوں اور ہم نشینوں کے معاملہ میں نظر ثانی کرے۔ جو لوگ ماضی میں فعل گناہ پر اس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، ان سے دوری اختیار کرے۔

۳۔ جب کبھی گناہ کا وسوسہ اس کے دل میں پیدا ہو، فوراً اللہ کے ذکر میں مشغول ہو جائے کیونکہ:

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾

''اللہ کے ذکر سے دلوں کو سکون ملتا ہے۔'' (رعد: ۲۸)

۴۔ جن گناہوں کو اس نے ترک کیا ہے، ہر وقت ان کے خطرناک اثرات و نتائج کے بارے میں غور و فکر کرتا رہے اور ان آثار کو ہمیشہ مدنظر رکھے تاکہ ان سے غفلت کے نتیجہ میں دوبارہ گناہ کی خواہش اس کے اندر پیدا نہ ہو جائے اور اس کا دل وسوسوں کے حملے کا شکار نہ ہو جائے۔

۵۔ ان لوگوں کے حالات و واقعات کو ہمیشہ یاد رکھے جو گناہوں کی وجہ سے دردناک انجام سے دوچار ہوئے، حتیٰ کہ معصوم انبیاء کے حالات کا بھی مطالعہ کرے جو ترکِ اولیٰ کے مرتکب ہوئے۔ مثلاً انسان کو ہمیشہ چاہیے کہ وہ اس بارے میں غور و فکر کرے کہ کس طرح حضرت آدم علیہ السلام اس عظیم مقام پر ہوتے ہوئے جنت سے نکال دیئے گئے، یا حضرت یونسؑ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی وجہ سے شکم ماہی میں قید کر دیئے گئے، یا وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے حضرت یعقوب علیہ السلام سالہا سال تک اپنے بیٹوں کی جدائی کا عذاب برداشت کرتے رہے۔

ان چیزوں کے مطالعہ سے یقیناً وسوسے کمزور ہوجاتے ہیں اور توبہ پائیدار ہوجاتی ہے۔

۶۔ تائب پر لازم ہے کہ گناہوں کی ان سزاؤں کے بارے میں سوچا کرے جن کی خبر دی گئی اور اس بات کو ہرگز فراموش نہ کرے کہ ہوسکتا ہے کہ توبہ کے بعد گناہ کی صورت میں اس کی سزا اور بھی سخت ہو۔

اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ان رحمتوں اور عنایات پر بھی توجہ رکھے جو توبہ کرنے والوں کو نصیب ہوتی ہیں اور جن میں وہ خود بھی شامل ہو چکا ہے اور اپنے آپ کو یہ تلقین کرتا رہے کہ اس نے ان رحمتوں اور عنایات کی حفاظت کرنی ہے اور جو مقام اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کیا ہے، اسے کھونا نہیں ہے۔

۷۔ اپنے تمام اوقات کے لیے صحیح اور مثبت کاموں کا ایک نظام الاوقات (Time Table) بنائے اور اس کے مطابق ایک آبرومندانہ زندگی کے لیے ضروری کام، اللہ تعالیٰ کی عبادت اور صحت مند تفریحی کاموں میں مشغول رہے، اس لیے کہ بیکاری ایک بہت بڑی مصیبت ہے جو گناہ کی طرف واپس لے جانے والے وسوسوں کے لیے سازگار حالات پیدا کر دیتی ہے۔

کسی عالم سے پوچھا گیا کہ اس حدیث کے کیا معنی ہیں کہ "التائب حبیب الله"یعنی "تائب اللہ کا محبوب ہوتا۔" انہوں نے جواب دیا کہ تائب سے مراد وہ شخص ہے جو اس آیت کا مصداق ہے:

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

"توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، اللہ کی عبادت کے لیے سرگرم عمل رہنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، امر المعروف اور نہی از منکر کرنے والے، اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے، ایسے مومنین کو بشارت دے دو۔" (توبہ: ۱۱۲)

۸۔ توبہ کے درجات

علمائے اخلاق نے توبہ اور تائبین کے مختلف مراتب و مدارج بیان کیے ہیں۔

ایک لحاظ سے تائبین کو چار گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

پہلا گروہ ان تائبین کا ہے جو اپنے گناہ سے توبہ کرتے ہیں اور کچھ عرصے کے بعد اپنی توبہ توڑ کر دوبارہ گناہ کی طرف پلٹ جاتے ہیں اور اس پر انہیں کوئی افسوس بھی نہیں ہوتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نفس امارہ کے درجہ میں پھنسے ہوتے ہیں۔ ان کا انجام مبہم اور خطرناک ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ ان کی زندگی کا خاتمہ توبہ پر ہو اور ان کی عاقبت اچھی ہوجائے۔ اس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی عمر کا خاتمہ توبہ شکنی پر ہو اور اس طرح ان کی عاقبت بہت بری اور دردناک ہو۔

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت کی راہ پر چلنے لگتے ہیں لیکن کبھی کبھار شہوات کے غلبہ کی وجہ سے توبہ شکنی کے مرتکب ہوجاتے ہیں لیکن توبہ شکنی پر نادم اور شرمندہ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ بھی پہلے گروہ کی طرح نفس امارہ کے درجہ پر ہوتے ہیں لیکن ان کی نجات کی امید ان کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔

تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو توبہ کرنے کے بعد گناہانِ کبیرہ سے اجتناب کرتے ہیں اور فرائض وواجبات کو پابندی سے ادا کرتے ہیں لیکن کبھی کبھار غیر ارادی طور پر، توبہ شکنی کے مقصد کے بغیر، کسی گناہ کے مرتکب ہوجاتے ہیں لیکن فوراً نادم اور پشیمان ہو جاتے ہیں اور اپنے نفس کو سرزنش کرنے لگتے ہیں اور ایک بار پھر پختہ عزم کے ساتھ توبہ کی راہ پر چل پڑتے ہیں۔ یہ حتی الامکان کوشش کرتے ہیں کہ گناہ کے محرکات وعوامل سے دور رہیں۔

یہ گروہ نفس لوامہ کے درجہ پر ہوتا ہے جو نفس امارہ کی نسبت بلند تر درجہ ہے۔ یہ نفس مطمئنہ کے قریب ہوتے ہیں اور ان کی نجات کی امید بہت زیادہ ہوتی ہے۔

چوتھا گروہ ان لوگوں کا ہے جو توبہ کے بعد فولادی عزم کے ساتھ اللہ کی اطاعت اور بندگی کی راہ پر ثابت قدم رہتے ہیں۔ چونکہ یہ معصوم نہیں ہوتے، لہٰذا ممکن ہے کبھی گناہ کا رجحان ان کے اندر پیدا ہوجائے۔ لیکن عملی طور پر یہ اپنے آپ کو گناہ سے آلودہ نہیں ہونے دیتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ایمان اور عقل کی طاقت اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے نفس کی لگام اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔

یہ لوگ صاحبِ نفس مطمئنہ ہوتے ہیں۔ سورۃ والفجر کی آیات ۲۷ اور ۳۰ میں انہی لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہے:

يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ﴿٢٩﴾ وَادْخُلِي جَنَّتِي ﴿٣٠﴾

''اے نفس مطمئنہ! اپنے رب کی طرف لوٹ آ، اس حال میں کہ تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے۔ میرے بندوں میں داخل ہوجا اور میری جنت میں داخل ہوجا۔''

اس کے علاوہ توبہ کے مراحل ومراتب کو اس طرح بھی بیان کیا جاسکتا ہے:

مرحلہ اول: کفر سے ایمان کی طرف توبہ۔

مرحلہ دوم: تقلیدی ایمان سے تحقیقی ایمان کی طرف توبہ۔

مرحلہ سوم: خطرناک اور بڑے گناہوں سے توبہ۔

مرحلہ چہارم: گناہانِ صغیرہ سے توبہ۔

مرحلہ پنجم: گناہ کی خواہش سے توبہ۔ اگرچہ عملی طور پر گناہ کا ارتکاب نہ ہو۔

اللہ کے بندوں میں سے ہر گروہ کی مخصوص توبہ ہوتی ہے۔ انبیاء کی توبہ اندرونی اضطرابات سے ہوتی ہے یعنی ان لحظات

سے ہوتی ہے جن میں ان کا باطن اللہ کی طرف متوجہ نہ ہو۔

اللہ کے برگزیدہ بندوں کی توبہ ان سانسوں سے ہوتی ہے جن میں وہ ذکر خدا کی حالت میں نہیں ہوتے۔

اولیاء کی توبہ ان نامناسب امور سے ہوتی ہے جو ان کی سوچ پر طاری ہوتے ہیں۔

خواص کی توبہ غیر اللہ کی طرف متوجہ اور مشغول ہونے سے ہوتی ہے۔

عوام کی توبہ گناہوں سے ہوتی ہے اور ان میں سے ہر ایک آغازِ توبہ میں ایک مخصوص درجہ کی معرفت اور آگاہی رکھتا ہے۔

(بحارالانوار،۶:۳۱)

۹۔توبہ کے اثرات وبرکات

حقیقی اور دل کی گہرائی سے اٹھنے والی جامع الشرائط توبہ یقیناً اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہوتی ہے اور اس کے اثرات و برکات بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ان اثرات کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ توبہ کرنے والا مسلسل کوشش کرتا رہتا ہے کہ دورانِ گناہ میں اس نے جو خرابیاں کی ہیں، حتی الامکان ان کی اصلاح کرے اور وہ اپنے کئے پر نادم اور شرمندہ ہوتا ہے۔

۲۔ حقیقی تائب اپنے آپ کو گناہ کی محافل سے دور رکھتے ہیں اور ان عوامل سے بھی دور رہتے ہیں جو ان کے اندر گناہ کی رغبت پیدا کر سکتے ہیں۔

۳۔ تائب اپنے آپ کو اللہ کی بارگاہ میں شرمندہ محسوس کرتے ہیں اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی مسلسل کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔

ان علامات کے ذریعے ہم حقیقی توبہ کرنے والوں کو زبانی توبہ کرنے والوں سے پہچان سکتے ہیں۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں کہ:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ

''اے اہل ایمان! اللہ کی بارگاہ میں خالص توبہ کرو۔''(تحریم:۸)

کہا ہے کہ ''نصوح'' سے مراد وہ توبہ ہے جس میں لوگوں کیلئے نصیحت پائی جاتی ہو، یعنی جسے دیکھ کر دوسرے گناہگاروں کو بھی توبہ کی ترغیب ملے، اس لئے کہ اس توبہ کے آثار تائب کے اندر ظاہر ہو چکے ہوتے ہیں اور وہ اپنے عمل سے دوسروں کو یہ درس دے رہا ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنے دل سے گناہوں کی جڑیں نکال پھینکیں اور کبھی گناہ کی طرف واپس نہ جائیں۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ اس سے مراد خالص توبہ ہے، جبکہ بعض نے کہا ہے کہ نصوح ''نصاحت'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی سلائی کرنے کے ہیں، اس لئے کہ گناہ ایمان کے لباس کو پارہ پارہ کر دیتا ہے اور خالص اور سچی توبہ اس پارہ پارہ لباس کو سینے کا کام کرتی

ہے، یا یہ کہ گناہ انسان اور اللہ کے تعلق کو منقطع کر دیتا ہے اور توبہ اس تعلق کو پھر جوڑ دیتی ہے۔ (بحار الانوار ۶:۱۷)

توبہ کے فوائد اور برکات بہت زیادہ ہیں جن کی طرف قرآن وسنت میں تفصیل سے بات کی گئی ہے۔ ان فوائد اور برکات کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ توبہ گناہ کو مٹا دیتی ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ۭ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ

''اے اہل ایمان! اللہ کی بارگاہ میں خالص توبہ کرو۔ امید ہے کہ وہ تمہارے گناہوں کو مٹا دے گا۔'' (تحریم۔۸)

۲۔ توبہ کرنے والوں پر زمین وآسمان سے برکتیں نازل ہوتی ہیں۔ سورۂ نوح آیات ۱۰ تا ۱۲ میں ہے:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُّرْسِلِ السَّمَاۗءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝

''میں نے (اپنی قوم سے کہا): تم اپنے رب سے مغفرت طلب کرو، وہ بڑا بخشنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے برکت والی بارشیں برسائے گا۔ تمہارے اموال واولاد میں اضافہ کرے گا، تمہیں سرسبز باغات دے گا اور تمہارے لئے نہریں جاری کرے گا۔''

۳۔ توبہ صرف گناہ کو مٹاتی ہی نہیں بلکہ اسے نیکی میں تبدیل کر دیتی ہے:

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰۗىِٕكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۭ

''سوائے ان لوگوں کے جو توبہ کریں، ایمان لائیں اور عمل صالح انجام دیں، تو اللہ ان کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دے گا۔'' (فرقان:۷۰)

۴۔ اگر توبہ سچی اور خالص ہو تو اللہ تعالیٰ گناہ کے اثرات کو اس طرح مٹا دیتا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اذا تاب العبد توبة نصوحا احبه الله و ستر عليه فى الدنيا و الآخرة فقلت و كيف يستر عليه؟ قال ينسى ملكيه ما كتبا عليه من الذنوب ويوحى الى جوارحه اكتمى عليه ذنوبه، ويوحى الى بقاع الارض اكتمى ما كان يعمل عليك من الذنوب فيلقى الله حين يلقاه و ليس شىء يشهد عليه بشيئ من الذنوب

(اصول کافی ۲:۴۳۰)

''جب بندہ خالص اور سچی توبہ کرتا ہے تو اللہ اس سے محبت کرتا ہے اور دنیا میں اس پر پردہ ڈال دیتا ہے۔''

راوی کہتا ہے کہ میں نے پوچھا: کس طرح پردہ ڈال دیتا ہے؟

آپؑ نے فرمایا: جو فرشتے گناہ لکھتے ہیں، انہیں اس کا گناہ بھلا دیتا ہے، اس کے اعضاء و جوارح کو حکم دیتا ہے کہ اس کے گناہ کو چھپا دیں۔ زمین کے جس حصے پر اس نے گناہ کیا ہوتا ہے، اسے حکم دیتا ہے کہ اس کا گناہ چھپا دے۔ پھر جب وہ اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے تو اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی جو اس کے خلاف گواہی دے۔''

۵۔ حقیقی تائب اس طرح اللہ کی محبت اور عنایت کا مستحق قرار پاتا ہے کہ حاملانِ عرش الٰہی اس کیلئے استغفار کرتے ہیں اور اس کے اور اس کے خاندان کیلئے جنت میں داخلے کی دعا کرتے ہیں۔ حدیث میں ہے:

ان الله عزوجل اعطى التائبين ثلاث خصال، لو اعطى خصلة منها جميع اهل السماوات والارض لنجوا بها

''اللہ تعالیٰ نے حقیقی تائب کو تین فضیلتیں عطا کی ہیں۔ اگر ان میں سے ایک بھی تمام اہل آسمان و زمین کو دی جاتی تو وہ اس کے سبب نجات پا لیتے اور وہ یہ ہے کہ:

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾ (بقرہ:۲۲۲)

یعنی ''اللہ توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے اور طہارت اختیار کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

ظاہری بات ہے کہ جس سے اللہ محبت کرے، اسے سزا نہیں دے گا۔

اس کے بعد حدیث میں اس آیت کا حوالہ دیا گیا ہے:

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿۷﴾ رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ الَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۸﴾ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ ۭ وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ۭ وَذٰلِكَ

هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۹﴾

''وہ فرشتے جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے گرد طواف کرتے ہیں اور اپنے رب کی حمد وتسبیح کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اہل ایمان کیلئے استغفار کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! تیری رحمت اور تیرا علم ہر چیز پر چھائے ہوئے ہیں۔ پس تو ان لوگوں کو بخش دے جنہوں نے توبہ کی اور تیری راہ پر چلے اور ان کو عذاب جہنم سے بچا۔ اے ہمارے رب! تو انہیں جنت کے باغوں میں داخل فرما جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور ان کے آباء، ازواج اور اولاد میں سے جو صالح تھے، ان کو بھی۔ تو غالب اور حکیم ہے اور انہیں برائیوں سے محفوظ رکھ اور جس کو اس دن تو نے برائیوں سے محفوظ رکھا، تو نے اسے اپنی رحمت میں داخل کر لیا اور یہی عظیم کامیابی ہے۔'' (مومن ۷ تا ۹)

اس مقام پر ہم توبہ کے بارے میں، جو کہ تہذیبِ اخلاق کی طرف پہلا عملی قدم ہے، اپنی بحث کو ختم کرتے ہیں۔ اگر چہ اس سلسلہ میں اور بھی مباحث ہیں جن کا توبہ کے بارے میں ایک مستقل بحث میں ذکر کیا جانا چاہئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب تک قلب گناہ کے زنگ سے پاک نہ ہو اور انسان کی جان اور روح توبہ کے پانی کے ذریعے پاک نہ ہو جائے اور توبہ کا نور گناہ کی تاریکی کو باہر نہ نکال دے، تہذیب اخلاق، سیر وسلوک الی اللہ، قرب الٰہی کی منزل تک پہنچنا، نورِ ہدایت اور نا قابل بیان عرفانی جذبات میں غرق ہو جانا ناممکن ہے۔

یہ پہلی منزل ہے اور ایسی منزل ہے جو ہر منزل سے زیادہ اہم ہے۔ اس منزل تک پہنچنا پختہ ارادے اور اللہ تعالیٰ کی مدد اور الطاف کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

دوسرا قدم۔ مشارطہ

سیر وسلوک کے مراحل کے بارے میں گزشتہ صفحات میں ہم نے مختصراً اشارہ کیا ہے۔ اب وہ مرحلہ آ چکا ہے کہ ہم آیات و روایات کی روشنی میں ان کے بارے میں تفصیل سے بات کریں۔

علمائے اخلاق نے توبہ کے بعد جس قدم کا ذکر کیا ہے، وہ مشارطہ ہے۔ مشارطہ کے معنی ہیں اپنے نفس کے ساتھ شرط باندھنا۔ اس میں ہر روز اپنے نفس کو نصیحت اور یاد دہانی کروائی جاتی ہے۔ اس کا بہترین وقت صبح کی نماز سے فراغت کے بعد بیان کیا گیا ہے جو اس عبادت کے نور سے منور ہوتا ہے۔

اس کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہتا ہے اور یاد آوری کرواتا ہے کہ میرے پاس عمر سے زیادہ قیمتی کوئی سرمایہ نہیں ہے۔ اگر یہ سرمایہ برباد ہو گیا تو میرا سب کچھ برباد ہو جائے گا۔ انسان کو چاہئے کہ سورۃ العصر کی تلاوت کر کے اپنے

نفس سے کہے کہ اگر میرا سرمایہ ضائع ہو گیا تو میں بہت بڑے اور نا قابل تلافی نقصان سے دوچار ہو جاؤں گا۔ اس نقصان کی تلافی صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب میں ایمان، عمل صالح، حق کی تلقین اور صبر کی تلقین جیسا سرمایہ اکٹھا کرسکوں۔

انسان اپنے آپ سے کہے کہ ذرا سوچو! اگر اس حالت میں تمہاری زندگی کا چراغ گل ہو جائے اور مرنے کے بعد کے مراحل کی سختیاں دیکھ کر تم سخت پشیمان ہو کر گڑگڑاتے ہوئے فرشتوں سے التجا کرو:

رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ

''اے فرشتو! اللہ کیلئے مجھے دنیا میں واپس بھیج دو تا کہ اپنی کوتاہیوں کے مقابلہ میں اچھے اعمال انجام دے سکوں۔'' (مومنون:۹۹،۱۰۰)

فرض کرو کہ فرشتوں نے ''کلا'' (ہرگز نہیں) کہہ کر تمہیں منفی جواب دے دیا تو بتاؤ کہ اس زندگی میں کی گئی کوتاہیوں کی تلافی کس طرح کرو گے!

پھر اپنے ساتوں اعضاء، آنکھ، کان، زبان، ہاتھ، پاؤں، پیٹ اور شرمگاہ کے بارے میں اپنے نفس سے اس طرح گفتگو کرے کہ یہ اعضاء تیرے کارکن اور خادم ہیں اور تیرے تابع فرمان ہیں۔ کیا تم جانتے ہو کہ جہنم کے سات دروازے ہیں اور ہر دروازے سے ایک خاص گروہ کو جہنم میں داخل کیا جائے گا؟ ہوسکتا ہے یہ سات دروازے ان سات اعضاء سے گناہ کرنے والوں کیلئے ہوں، پھر کیوں نہ ان اعضاء کو قابو میں رکھ کر جہنم کے دروازوں کو اپنے اوپر بند کر لیا جائے اور جنت کے دروازے اپنے اوپر کھول لئے جائیں۔

اسی طرح اپنے نفس کو اپنے ان اعضاء کے بارے میں سمجھائے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتیں ہیں۔ ان سے اللہ کی نافرمانی نہیں کرنی چاہئے بلکہ ان کو صرف اُس کی اطاعت میں استعمال کرنا چاہئے۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی بعض دعاؤں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مشارطہ کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ صحیفۂ سجادیہ کی اکتیسویں دعا میں، جو دعائے توبہ کے نام سے معروف ہے، آپؑ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں:

ولك يارب شرطي الا اعود في مكروهك، وضماني ان لا ارجع في مذمومك وعهدي ان اهجر جميع معاصيك

''اے میرے رب! میں نے تیری بارگاہ میں یہ شرط کی ہے کہ جو کچھ تجھے پسند نہیں ہے، اس کی طرف واپس نہ لوٹوں گا اور میں یہ عہد کرتا ہوں کہ جن چیزوں کی تو نے مذمت کی ہے، ان کے قریب نہ جاؤں گا اور جن چیزوں سے تو نے منع فرمایا ہے، ان سے دور رہوں۔''

قرآنی آیات سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کے اصحاب اہم امور سے متعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد کیا کرتے تھے

اور یہ بھی مشارطہ کی ایک قسم ہے۔سورۂ احزاب، آیت ۲۳ میں ہے:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾

''مومنین کے درمیان کچھ ایسے افراد ہیں جنہوں نے اللہ سے کئے ہوئے عہد کوسچائی کے ساتھ پورا کیا (اوراس راہ میں شہادت پائی) جبکہ ان میں سے بعض منتظر ہیں اور انہوں نے اپنے عہد میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔''(بحارالانوار، ٦٧: ٦٤)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض اللہ سے عہد اور شرط باندھتے تھے اوراسے توڑ دیتے تھے۔اس آیت سے پہلے آیت ۱۵ میں ہے:

وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ۭ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْئُوْلًا ﴿۱۵﴾

'(کچھ لوگ جو جنگ احزاب میں دوسروں کو میدانِ جنگ سے واپسی کی ترغیب دیتے تھے)اس سے پہلے اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کر چکے تھے کہ وہ میدان میں پیٹھ نہیں دکھائیں گے اوراللہ کے عہد کے بارے میں ان سے سوال کیا جائے گا۔''

ایک حدیث میں امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

من لم يتعاهد النقص من نفسه غلب عليه الهوى، و من كان في نقص فالموت خير له

''جوشخص اپنی ذات کے نقائص کی چھان بین نہ کرے،اس کی خواہشات اس پر غالب آ جاتی ہیں اور جوشخص نقص کی حالت پر باقی رہے،اس کیلئے موت بہتر ہے۔''(بحارالانوار ٦٧: ٦٤)

مختصر یہ کہ مشارطہ تہذیب اخلاق کی راہ میں اٹھایا جانے والا ایک اہم قدم ہے۔اس کے بغیر غفلت وفریب کے سیاہ بادل انسان کے دل پر اپنا منحوس سایہ ڈال دیتے ہیں اوراس کی نجات بہت مشکل ہوجاتی ہے۔

تیسرا قدم مراقبہ

''مراقبہ'' رقبہ سے ماخوذ ہے اورعربی میں رقبہ گردن کو کہتے ہیں۔جب انسان کسی چیز کی نگرانی کرتا ہے تو اپنی گردن اونچی کر کے دیکھتا ہے۔لہٰذا مراقبہ کا لفظ نگرانی کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

علمائے علم اخلاق کی اصطلاح میں اس کے معنی ہیں:''اپنے آپ کی نگرانی کرنا۔'' مراقبہ کا مرحلہ مشارطہ کے بعد آتا ہے۔

یعنی جب انسان مشارطہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی اور گناہ سے اجتناب کا عہد کر لیتا ہے تو اس کے بعد اس پر لازم ہوتا ہے کہ وہ اپنی پاکیزگی پر کڑی نظر رکھے، اس لئے کہ غفلت کی صورت میں ممکن ہے کہ اس کے تمام عہد و پیمان و مشارطہ کی عمارت زمین بوس ہو جائے۔

البتہ انسان کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس سے پہلے کہ وہ اپنی نگرانی کرے۔ اللہ تعالیٰ کے فرشتے اس کے اعمال کی نگرانی کر رہے ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

وَاِنَّ عَلَيۡكُمۡ لَحٰفِظِيۡنَ ۙ‏﴿۱۰﴾

یعنی ''بے شک تمہارے اوپر حفاظت اور نگرانی کرنے والے (کراماً کاتبین) مقرر کیے گئے ہیں (جو تمہارے اعمال کی کڑی نگرانی کرتے ہیں)''۔ (سورۂ انفطار: ۱۰)

اس آیت میں حافظین سے مراد اعمال کی نگرانی کرنے والے ہیں جیسا کہ بعد والی آیت اسی مطلب پر دلالت کرتی ہے:

يَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ‏ ﴿۱۲﴾

یعنی ''جو کچھ تم کرتے ہو، وہ اسے جانتے ہیں۔'' (انفطار: ۱۲)

سورۂ ق کی آیت ۱۸ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

مَا يَلۡفِظُ مِنۡ قَوۡلٍ اِلَّا لَدَيۡهِ رَقِيۡبٌ عَتِيۡدٌ‏ ﴿۱۸﴾

''انسان جو لفظ بھی اپنے منہ سے نکالتا ہے، ایک فرشتہ اس کی نگرانی کیلئے مامور ہوتا ہے۔''

ان سب سے بڑھ کر خود اللہ تعالیٰ ہمارے اعمال کا سب سے بڑا نگران ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيۡكُمۡ رَقِيۡبًا‏ ﴿۱﴾

''یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر نگران ہے۔'' (نساء: ۱)

سورۂ احزاب کی آیت ۵۲ میں یہ بات اس طرح بیان کی گئی ہے:

وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ رَّقِيۡبًا ﴿۵۲﴾

''اور اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔''

سورۂ علق، آیت ۱۴ میں ہے:

اَلَمۡ يَعۡلَمۡ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ؕ‏ ﴿۱۴﴾

''کیا انسان نہیں جانتا کہ اللہ (اس کے تمام اعمال و اموال) کو دیکھ رہا ہے؟''

سورۂ سبا، آیت ۲۱ میں ہے:

وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿۲۱﴾

''اور تیرا رب ہر چیز پر محافظ ہے۔''

لیکن سالکانِ راہِ حق، اس سے پہلے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اس کے اعمال کی نگرانی کریں، خود اپنے اعمال کی نگرانی کرتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر یہ مراقبت اندر سے اٹھتی ہے، باہر سے مسلط نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا اثر بہت زیادہ اور غیر معمولی ہوتا ہے۔ البتہ بیرونی مراقبت پر توجہ دی جائے تو اندرونی مراقبت کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں۔

درحقیقت اس دنیا میں انسان کی حیثیت اس شخص کی مانند ہے جس کے پاس گراں بہا موتی ہیں۔ وہ بازار میں جاتا ہے تاکہ ان کے بدلہ اپنے لئے بہترین اربابِ زندگی خریدے لیکن وہ دیکھتا ہے کہ اس کے اردگرد چوروں اور ٹھگوں کا ہجوم ہے۔ ایسی صورت میں وہ ذرا سی بھی غفلت کرے تو اس کا نفیس اور قیمتی سرمایہ لٹ سکتا ہے اور وہ حسرت واندوہ سے ہاتھ ملتا رہ جائے گا۔

بالکل اسی طرح شیاطین جن وانس، اس دنیا میں انسان کو گھیرے ہوئے ہیں۔ اندرونی ہوا و ہوس بھی اسے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اگر وہ اپنے آپ کو اللہ کے سپرد نہ کرے اور اپنے اعمال کی نگرانی نہ کرے تو اس کے ایمان اور تقویٰ کا سرمایہ لٹ جائے گا اور وہ اس دنیا سے اگلی دنیا کو جاتے وقت خالی ہاتھ ہوگا۔

قرآنی آیات واحادیث میں اس حقیقت کی طرف متعدد مقامات پر اشارہ کیا گیا ہے:

اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ﴿۱۴﴾

''کیا انسان نہیں جانتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے؟'' (علق: ۱۴)

یہ آیت ہمیں اس حقیقت کی طرف متوجہ کررہی ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ ہمارے اعمال کو دیکھ رہا ہے، لہٰذا ہمیں بھی چاہئے کہ اپنے اعمال پر نظر رکھیں۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾ (حشر: ۱۸)

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کی نافرمانی سے پرہیز کرو۔ ہر انسان یہ دیکھتا رہے کہ اس نے کل کیلئے کیا آگے بھیجا ہے۔ اللہ کی نافرمانی سے پرہیز کرو (اور جان لو کہ) اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔''

اس آیت میں یہ جملہ ''وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ'' (ہر انسان دیکھے کہ اس نے کل کیلئے کیا آگے بھیجا ہے)، درحقیقت مراقبہ کے مفہوم کو بیان کررہا ہے۔

ایک اور مقام پر اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ ﴿۲۴﴾

''انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے کھانے پر نظر رکھے۔'' (عبس: ۲۴)

یعنی انسان یہ دیکھے کہ اس نے کھانا حلال کے راستے سے حاصل کیا ہے یا حرام کے راستے سے۔

۲۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس آیت کی تفسیر میں:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ

یعنی ''اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔'' فرماتے ہیں:

الاحسان ان تعبد الله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك

''احسان یعنی نیکی یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔'' (کنز العمال، ۳: ۲۲، بحار الانوار، ۲۵: ۲۰۴)

یہ بڑی واضح سی بات ہے کہ اگر انسان اس حقیقت کی طرف توجہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت، ہر جگہ اور ہر حال میں ہمارے اعمال کو دیکھ رہا ہے، تو اس سے اس کے اندر مراقبہ کی روح زندہ ہو جاتی ہے تا کہ وہ مسلسل اپنے اعمال کی نگرانی کرے۔

۳۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: (غرر الحکم)

ينبغي ان يكون الرجل مهيمنا على نفسه، مراقبا قلبه، حافظا لسانه

''انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے اوپر حاوی رہے، اپنے دل کی نگرانی کرے اور اپنی زبان کی حفاظت کرے۔''

۴۔ ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

من رعى قلبه عن الغفلة و نفسه عن الشهوة و عقله عن الجهل، فقد دخل في ديوان المتنبهين، ثم من رعى عمله عن الهوى، ودينه عن البدعة، وماله عن الحرام فهو من جملة الصالحين

''جو شخص اپنے دل کی غفلت سے، اپنے نفس کو شہوت سے اور اپنی عقل کو جہل سے بچائے، اس کا نام بیدار اور آگاہ افراد کے دیوان (رجسٹر) میں لکھا جاتا ہے۔ جو کوئی اپنے عمل کو نفس پرستی سے، اپنے دین کو بدعت سے اور اپنے مال کو حرام سے بچائے، وہ صالحین میں شمار ہوگا۔'' (بحار الانوار، ۶۷: ۶۸)

۵۔ ایک حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یابوسا للقانطین من رحمتی، و یابوسا لمن عصانی ولم یراقبنی

''بدنصیب ہیں وہ جو میری رحمت سے مایوس ہیں اور بدنصیب ہیں وہ جو میری نافرمانی کرتے ہیں اور توجہ نہیں رکھتے کہ میں دیکھ رہا ہوں۔'' (اصولِ کافی، ۲:۶۷)

۶۔ ایک خطبہ میں امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

فرحم اللہ امرء راقب ربہ وتنکب ذنبہ، وکابر ھواہ، وکذب مناہ

''اللہ اس شخص پر رحم کرے جو اپنے رب کی طرف متوجہ رہتا ہے، گناہ سے پرہیز کرتا ہے، اپنے نفس کی خواہش سے جنگ کرتا ہے اور اپنی آرزوؤں کو جھٹلاتا ہے۔'' (بحارالانوار، ۷۴:۳۴۹)

۷۔ نہج البلاغہ میں ہے:

فاتقوا اللہ عباد اللہ تقیۃ ذی لب شغل التفکر قلبہ ___ وراقب فی یومہ غدہ

''اللہ سے ڈرو، اس صاحب عقل شخص کی طرح جس کی سوچ نے اس کے دل کو مشغول رکھا ہوا ہے اور جو آج، کل (قیامت) کے بارے میں مراقبہ کرتا ہے۔'' (نہج البلاغہ، خطبہ ۸۳)

ان روایات میں اپنے بارے میں، اللہ کے بارے میں اور آخرت کے بارے میں مراقبہ کرنے کے ایک ہی معنی ہیں، یعنی اپنے اعمال اور اخلاق پر ہر وقت، ہر جگہ اور ہر حال میں کڑی نظر رکھنا۔

مختصر یہ کہ سالکانِ راہ خدا پر لازم ہے کہ مشارطہ یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندگی کا عہد و پیمان باندھنے کے بعد انسان اپنے اوپر مسلسل اور کڑی نگرانی رکھے تا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا ہوا یہ عہد و پیمان کسی بھی موقع پر ٹوٹنے نہ پائے۔ اس سلسلہ میں انسان کو اپنے نفس کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا چاہئے جیسے قرض خواہ مقروض سے کرتا ہے، اس لئے کہ جس طرح انسان دوسروں سے اپنے مالی مطالبات میں سستی کرے تو اس کا سرمایہ ضائع ہوسکتا ہے، اسی طرح اگر وہ معنوی معاملات میں اپنے نفس سے مطالبہ کرنے میں سستی کرے تو بہت بڑا نقصان اٹھائے گا۔

چوتھا قدم محاسبہ

چوتھا قدم جو علمائے علم اخلاق نے رہروانِ راہ قرب کیلئے بیان کیا ہے، وہ محاسبہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان ہر سال، ہر ماہ، ہر ہفتہ یا ہر دن کے اختتام پر اپنے اچھے اور برے اعمال، اطاعت و معصیت خدا اور خدا پرستی اور نفس پرستی کے حوالہ سے اپنا محاسبہ کرے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک تاجر اپنے تجارتی معاملات کا انتہائی باریک بینی سے محاسب کرتا ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ محاسبہ دینی امور میں ہو یا دنیوی امور میں، اس کا ان دو بڑے فائدوں میں سے ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ اگر محاسبہ کے نتیجہ میں زیادہ منافع نظر آئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا عمل صحیح تھا اور یہ کہ اسے اپنے اسی راستے پر آگے بڑھتے رہنا چاہئے۔ اگر محاسبہ کے دوران نقصان نظر آئے تو اسے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا طریقہ کار غلط تھا یا کہیں کوئی چور یا بد دیانت افراد اسے نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ایسی صورت میں لامحالہ وہ اپنے معاملات کی اصلاح کی طرف توجہ دیتا ہے۔

اس سلسلہ میں آیات واحادیث میں بھی وسیع پیمانے پر اشارات پائے جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں متعدد آیات ہمیں اس نکتہ پر غور وفکر کی دعوت دیتی ہیں کہ کائنات میں ہر جگہ ایک لطیف نظم وربط کام کر رہا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ کائنات میں ہر نظام حساب وکتاب کی بنیاد پر قائم ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ۝

''اس نے آسمان کو بلند کیا اور اس میں قانون مقرر کیا تاکہ تم میزان میں طغیان نہ کرو (اور اسے عدل اور حساب کی راہ سے منحرف نہ کردو)۔'' (الرحمن: ۷، ۸)

ایک اور مقام پر ہے:

وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ۝

یعنی ''اللہ کے پاس ہر چیز کی ایک مقدار (واضح حساب) ہے۔'' (سورۂ رعد: ۸)

اسی طرح ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ۡ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ (حجر: ۲۱)

''ہر چیز کے خزانے صرف ہمارے پاس ہیں اور ہم انہیں ایک مقررہ مقدار میں نازل کرتے ہیں۔''

قرآن شریف کی متعدد آیات میں قیامت کے دن کے سخت اور باریک بینی پر مبنی حساب کا ذکر ہے۔ حضرت لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ۝

''اگر ایک ذرے کے برابر بھی (کوئی اچھا یا برا عمل) ہو تو خواہ کسی چٹان کے اندر ہو یا آسمانوں میں ہو یا زمین میں، اللہ اسے (قیامت کے دن حساب کیلئے) لے آئے گا۔ اللہ لطیف اور خبیر ہے۔'' (لقمان: ۱۶)

نیز فرمانِ الٰہی ہے:

وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ (بقرہ:۲۸۴)

''جو کچھ تمہارے باطن میں ہے، خواہ اسے ظاہر کردیا یا چھپاؤ، اللہ اس پر تمہارا حساب لے گا۔''

یہ مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہی ''یوم الحساب'' ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ۝۲۶

''جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹک جاتے ہیں، ان کیلئے سخت عذاب ہے، اس لئے کہ وہ یوم حساب کو بھول گئے تھے۔'' (ص:۲۶)

قیامت کے دن کا حساب اس قدر سخت اور باریک بینی پر مبنی ہوگا کہ انسان کو خود ہی اپنا محتسب بنا دیا جائیگا۔

اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝۱۴

یعنی ''اپنا اعمال نامہ پڑھ۔ آج اپنا حساب کرنے کیلئے تو خود ہی کافی ہے۔'' (بنی اسرائیل:۱۴)

اس حقیقت کے پیش نظر کہ دنیا اور آخرت میں ہر چیز کا حساب ہے، انسان کیلئے اس بات کی گنجائش کیسے ہوسکتی ہے کہ وہ اس زندگی میں حساب سے غافل رہے! جب کل اسے اپنے ہر عمل کا حساب دینا ہے تو کیا یہ بہتر نہیں کہ آج سے، اسی دنیا میں اپنا محاسبہ کرے۔ بنابرایں مندرجہ بالا آیات اور ان جیسی دیگر آیات انسان کو یہ اہم پیغام دیتی ہیں کہ اپنے حساب سے غافل نہ رہے۔ اگر وہ چاہتا ہو کہ کل اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے وقت اس کی پشت پر گناہوں کا بوجھ نہ ہو تو اسی دنیا میں خود اپنا محاسبہ کرے، اس سے پہلے کہ اس دنیا میں اس کا حساب لیا جائے۔

احادیث میں بھی اس موضوع پر تفصیل سے بات کی گئی ہے۔

۱۔ ایک مشہور حدیث نبویؐ میں ہے:

حاسبوا انفسكم قبل ان تحاسبو اوزنوها قبل ان توزنو اوتجهزوا للعرض الاكبر

''اپنا محاسبہ کرو، اس سے پہلے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے اور اپنا وزن کرو، اس سے پہلے کہ تمہارا وزن کیا جائے اور (قیامت کے دن کی) بڑی حاضری کیلئے تیار ہوجاؤ۔'' (بحارالانوار:۶۷:۷۳)

۲۔ ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ نے حضرت ابوذرؓ غفاری کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

يااباذر حاسب نفسك قبل ان تحاسب فانه اهون لحسابك غدا وزن نفسك قبل توزن

''اے ابوذرؓ! اس سے پہلے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے، اپنا محاسبہ کرو اور اس سے پہلے کہ تمہارا وزن کیا

جائے اپنا وزن کرو۔'' (میزان الحکمہ ،۱:۱۹ بحوالہ امالی طوسی)

۳۔ ایک حدیث میں ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا:

ما احق للانسان ان تکون له ساعة لا یشغله شاغل یحاسب فیها نفسه، فینظر فیما اکتسب لها و علیها فی لیلها و نهارها

''انسان کیلئے کس قدر اچھا ہے کہ اپنے اوقات میں سے ایک ساعت مخصوص کرے جس میں کوئی کام اسے اپنی طرف مشغول نہ کرے، اس میں وہ اپنا محاسبہ کرے اور دیکھے کہ جو کام اس نے اپنے شب و روز میں انجام دیئے ہیں، ان میں سے کونسا اس کیلئے مفید اور کونسا نقصان دہ ہے۔'' (مستدرک الوسائل: ۱۲: ۱۵۴)

۴۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے اسی بات کو اس پیرائے میں بیان فرمایا ہے:

حق علی کل مسلم یعرفنا، ان یعرض عمله فی کل یوم و لیلة علی نفسه، فیکون محاسب نفسه، فان رای حسنة استزاد منها و ان رای سیئة استغفر منها لئلا یخزی یوم القیامة

''ہر مسلمان جو ہماری معرفت رکھتا ہے، اس پر لازم ہے کہ ہر شب و روز اپنے اعمال کا جائزہ لے، اپنا محاسبہ کرے۔ اگر کوئی نیکی دیکھے تو اس میں اضافہ کی دعا مانگے اور اگر اسے کوئی برائی نظر آئے تو اس سے استغفار کرے تا کہ قیامت کے دن رسوا نہ ہو۔'' (تحف العقول: ۲۳۱)

۵۔ اس بات کو حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

یا هشام لیس منا من لم یحاسب نفسه فی کل یوم فان عمل حسنة استزاد منه و ان عمل سیئا استغفر الله منه و تاب (مستدرک الوسائل ۱۲: ۱۵۳)

''اے ہشام! جو کوئی ہر روز اپنا محاسبہ نہ کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ پس اگر اس نے کوئی اچھا عمل کیا ہو تو اس میں اضافے کی دعا مانگے اور اگر کوئی برا عمل انجام دیا ہو تو اس سے استغفار اور توبہ کرے۔''

اس موضوع پر احادیث بہت زیادہ ہیں۔ جو حضرات ان کا مطالعہ کرنے کے خواہش مند ہوں، مستدرک الوسائل، کتاب الجہاد، ابواب جہاد النفس کی طرف رجوع کریں۔ (مستدرک الوسائل، ۱۲: ۱۵۲ تا ۱۵۶، اصول کافی ۲: ۴۵۳)

ان احادیث سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام میں محاسبۂ نفس کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور یہ کہ جو لوگ اہل محاسبۂ نفس نہیں ہیں، وہ آئمہ معصومینؑ کے سچے پیروکار نہیں ہیں۔

ان احادیث میں محاسبہ کے فلسفہ وحکمت کی طرف بھی واضح طور پر اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ کام نیکیوں میں اضافے اور برائیوں کی روک تھام اور تلافی کا باعث ہوتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ انسان گرداب ہلاکت میں گرنے اور غفلت کے دریا میں ڈوبنے سے بھی محفوظ ہوجاتا ہے۔

یہ بات بہت غور وفکر کے قابل ہے کہ ہم مادی اور معنوی امور کو یکساں اہمیت کیوں نہیں دیتے؟ مادی امور میں تو ہم بڑے حساب کتاب اور کھاتے وغیرہ کا انتہائی باریک بینی سے انتظام کرتے ہیں لیکن معنوی امور کا انگلیوں پر بھی حساب نہیں کرتے، حالانکہ معنوی امور کی اہمیت مادی امور کی نسبت اس قدر زیادہ ہے کہ ان کے درمیان موازنہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ رسولؐ اللہ ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

لایکون العبد مومنا حتی یحاسب نفسه اشد من محاسبة الشریك شریکه و السید عبده

''کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک اپنے نفس سے حساب لینے میں اتنی سخت گیری نہ کرے جتنی کوئی شریک اپنے شریک یا مالک اپنے غلام سے حساب لینے میں کرتا ہے۔'' (محاسبۂ نفس از سید ابن طاؤس: ۱۴، بحارالانوار، ۶۷، ۷۲)

یہ موضوع اس قدر اہم ہے کہ بعض بزرگوں نے محاسبۂ نفس کے عنوان سے کتابیں لکھی ہیں جن میں سید ابن طاؤس متوفی ۶۶۴ ہجری کی ''محاسبۃ النفس''، نویں ہجری کے عالم مرحوم کفعمی کی ''محاسبۃ النفس'' اور سید علی مرعشی متوفی ۱۰۸۰ ہجری کی ''محاسبۃ النفس'' اور حاج مرزا علی حائری مرعشی متوفی ۱۳۴۴ ہجری کی ''محاسبة النفس فی اصلاح عمل الیوم والاعتذار من الامس'' قابل ذکر ہیں۔

اس مقام پر چند امور کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:

۱۔ انسان کو اپنا محاسبہ کس طرح کرنا چاہئے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اپنا محاسبہ کرنے کا بہترین طریقہ وہی ہے جو امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے نقل کیا گیا ہے۔ وہ اس طرح کہ آپؑ نے رسول اللہؐ کی یہ حدیث بیان فرمائی:

اکیس الکیسین من حاسب نفسه

''عاقل ترین شخص وہ ہے جو اپنا محاسبہ کرے۔''

ایک شخص نے پوچھا:

و کیف یحاسب الرجل نفسه

یعنی''انسان کس طرح اپنا محاسبہ کرے؟''

امام علیہ السلام نے اسے تفصیلی جواب دیتے ہوئے فرمایا:

''جب سارا دن گزر جانے کے بعد شام ہوتو اپنے نفس کو مخاطب قرار دے کر کہو: اے نفس! آج کا دن گزر گیا اور قیامت تک واپس نہیں آئے گا۔ اللہ تعالیٰ تجھ سے اس کے بارے میں پوچھے گا کہ تو نے یہ دن کیسے گزارا؟ اس دن میں کیا عمل کیا؟ آیا اللہ کا ذکر کیا اور اس کی حمد کی؟ آیا کسی مومن کی غیبت کو روکا؟ آیا کسی مسلمان کی مدد کی؟ آج کون کون سے مثبت کام کئے؟

اس کے بعد دن بھر کے کاموں کو یاد کرے۔ اگر اس نے کوئی اچھا عمل کیا ہو تو اللہ کی حمد کرے اور تکبیر کہے کہ اس نے اللہ کی توفیق سے یہ نیکی انجام دی۔ اگر اس کا کوئی برا عمل اسے یاد آئے تو اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے اور اسے ترک کرنے کا پختہ عزم کرے اور محمدؐ و آلِ محمدؐ پر صلوات بھیج کر اور امیر المؤمنین علیہ السلام سے تجدید بیعت کے ذریعے اپنے دل سے اس کے آثار کو محو کرنے کی کوشش کرے اور انؑ کے دشمنوں پر اور انؑ کے حقوق روکنے والوں پر لعنت کرے۔''

جب انسان یہ جامع اور کامل محاسبہ انجام دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''چونکہ تو ان سے محبت کرتا ہے جو میرے محبوب ہیں اور ان سے دشمنی کرتا ہے جو میرے دشمن ہیں (اور تیرے اس محاسبۂ نفس کی وجہ سے) میں تیرے گناہوں پر سخت گیری نہیں کروں گا اور تجھے اپنے عفو میں داخل کروں گا۔'' (بحارالانوار:۸۹:۲۵۰)

بلاشبہ یہ محاسبہ کا بہترین طریقہ ہے۔

۲۔ محاسبۂ نفس کے آثار کیا ہیں؟

اگرچہ اس سوال کا جواب گزشتہ بیانات سے واضح ہوجاتا ہے لیکن بہتر ہے کہ جو کچھ اس بارے میں احادیث میں بیان ہوا ہے، اس سے بھی استفادہ کیا جائے۔

امیر المؤمنین علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

من حاسب نفسه وقف علی عیوبه و احاط بذنوبه، و استقال الذنوب واصلح العیوب

''جو کوئی محاسبۂ نفس کرتا ہے، اپنے عیوب سے واقف ہوجاتا ہے اور اپنے گناہوں کا احاطہ کر لیتا ہے، اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہے اور اپنے عیوب کی اصلاح کرتا ہے۔'' (غررالحکم)

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

من حاسب نفسه سعد

''جو اپنا محاسبہ کرتا ہے، خوش نصیب ہو جاتا ہے۔'' (مستدرک الوسائل: ۱۲: ۱۵۴)

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

ثمرة المحاسبة صلاح النفس

یعنی ''اصلاحِ نفس محاسبہ کا ثمر ہے۔'' (غرر الحکم)

بعض علمائے اخلاق نے محاسبہ کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ محاسبہ اس طرح سے کیا جائے جیسے اپنے شریک کار سے کیا جاتا ہے۔ اگر منافع حاصل ہو تو اپنا حصہ وصول کرے اور شریک کار کا شکریہ ادا کرے، اگر نقصان پر نظر پڑے تو شریک کار کو اس کا ذمہ دار ٹھہرائے اور اسے مستقبل میں اس نقصان کی تلافی پر مجبور کرے۔

انسان کا سب سے اہم سرمایہ یعنی اس کی عمر کا بھی یہی حال ہے۔ یہ سرمایہ انسان کے نفس کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا نفع کار ہائے خیر اور اس کا خسارہ اور نقصان گناہ ہیں۔ اس کی تجارت کا وقت دن بھر کے اوقات اور اس کا شریک تجارت اس کا نفس امارہ ہے۔

انسان پر لازم ہے کہ محاسبہ کرتے وقت سب سے پہلے اپنے نفس سے فرائض کا حساب لے۔ اگر سارے فرائض انجام دیئے گئے ہوں تو اللہ کا شکر ادا کرے اور اس راہ پر چلنے میں اپنی حوصلہ افزائی کرے۔ اگر کوئی فریضہ ادا ہونے سے رہ گیا ہو تو اپنے آپ سے اس کی قضا بجالانے کا مطالبہ کرے۔ اگر کوئی فریضہ ناقص طور پر انجام دیا گیا ہو تو نوافل کے ذریعے اس کے نقص کی تلافی کرے۔ اگر اس نے کسی معصیت اور گناہ کا ارتکاب کیا ہو تو اس کی تلافی کا مطالبہ کرے، جیسے ایک تاجر اپنے شریک کار سے محاسبہ کرتا ہے، یہاں تک کہ چھوٹی سی رقم کے بارے میں بھی اسے کوئی رعایت نہیں دیتا تا کہ اسے کوئی نقصان نہ اٹھانا پڑے۔ انسان کو نفس امارہ کے ساتھ خاص طور پر ایسا ہی برتاؤ کرنا چاہئے کیونکہ وہ انتہائی مکار اور چالباز ہے۔

انسان کو چاہئے کہ جو محاسبہ قیامت کے دن فرشتوں نے کرنا ہے، اسی دنیا میں خود اپنے لئے کرے، یہاں تک کہ محاسبہ کرتے وقت اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات، اپنے اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سونے جاگنے بولنے اور خاموشی پر بھی اپنا محاسبہ کرے۔ مثلاً اپنے نفس سے سوال کرے کہ فلاں مقام پر کیوں خاموش رہے؟ فلاں موقع پر فلاں بات کیوں کہی؟ (بہتر ہے کہ انسان روز بروز یا ہر گھنٹے اپنا محاسبہ کرے، ورنہ معاملہ اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا)۔

اگر انسان اپنی زندگی میں انجام دیئے جانے والے ہر گناہ پر ایک کنکر اپنے گھر کے کسی کونے میں رکھتا رہے تو کچھ عرصہ بعد اس کے گھر کا صحن کنکروں سے بھر جائے گا۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ انسان اپنے نقائص اور عیوب کا محاسبہ کرنے کو اہمیت نہیں دیتا۔ لیکن جو فرشتے اللہ تعالیٰ نے ہمارے اعمال لکھنے کیلئے مقرر فرمائے ہیں، وہ اپنا کام انتہائی باریک بینی سے انجام دیتے ہیں۔ ان سے بھی بڑھ کر اللہ تعالیٰ تمام اعمال کا احاطہ کئے ہوئے ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ ط

یعنی ''اللہ نے اس کا احاطہ کیا ہوا ہے اور یہ اسے بھولے ہوئے ہیں۔'' (مجادلہ:٦)

ہم اس بحث کا اختتام اس حدیث پر کرتے ہیں جس میں بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن کس طرح محاسبہ ہوگا تاکہ ہم دنیا میں محاسبہ کا طریقہ سیکھ سکیں:

رسول اللہؐ فرماتے ہیں:

لا تزول قدما عبد یوم القیامة حتی یسئل عن اربع عن عمره فی ما افناه و عن شبابه فی ما ابلاه. وعن ماله من این اکتسبه و فی ما انفقه و عن حبنا اهل البیت (خصال صدوق:۲۵۳)

''قیامت کے دن قدم اٹھانے سے قبل ہر انسان سے چار چیزوں کا سوال کیا جائے گا:

۱۔اس نے اپنی عمر کہاں فنا کی؟

۲۔اپنی جوانی کو کہاں صرف کیا؟

۳۔مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟

۴۔ہم اہل بیتؑ کی محبت کے بارے میں سوال کیا جائے گا (کہ آیا ہماری محبت کا حق ادا کیا یا نہیں؟)''

پانچواں قدم معاتبہ و معاقبہ (سرزنش اور سزا)

پانچواں قدم جو محاسبہ کے بعد آتا ہے، وہ معاتبہ اور معاقبہ ہے یعنی سرزنش اور سزا۔ یعنی انسان اپنے نفس کو اس کی خطاؤں اور خلاف ورزیوں پر سرزنش کرے اور سزا دے، اس لئے کہ اگر انسان محاسبہ کرے اور غلط کاموں کے خلاف کسی ردِعمل کا مظاہرہ نہ کرے تو محاسبہ کا الٹا اثر ہوگا یعنی نفس مزید جری اور دلیر ہو جائے گا۔

جب انسان اپنے نوکروں اور ملازمین کا محاسبہ کرتا ہے تو ان کے غلط کاموں پر اپنے ردِعمل کا اظہار کرتا ہے جو ہلکی سرزنش سے سخت سزا تک کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ قربِ الٰہی کے سفر میں مشغول ہیں، انہیں بھی چاہئے کہ اپنے سرکش نفس کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کریں، ورنہ محاسبۂ نفس کا الٹا نتیجہ برآمد ہوگا یعنی اس کی جرأت اور حوصلے میں اضافہ ہو جائے گا۔

قرآن مجید میں اس مسئلہ کو اس قدر اہمیت دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نفس لوامہ کی قسم کھاتے ہوئے فرمایا ہے:

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝۲

''میں نفس لوامہ کی قسم کھاتا ہوں۔'' (سورۂ قیامت:۲)

ہم سب یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ نفس لوامہ سے مراد انسان کا زندہ اور بیدار ضمیر ہے جو برے اعمال کی انجام دہی

پر اسے سرزنش کرتا ہے۔ یہ بذاتِ خود ایک قسم کی سزا ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ برے کاموں کی انجام دہی پر اپنے آپ کو سزا دینے کے مختلف درجات ہیں جو ملامت سے شروع ہوتے ہیں اور پھر نفس امارہ کو مختلف لذتوں سے محروم کرنے کی صورت میں شدید سے شدید تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔

قرآن مجید میں اس کی دلچسپ مثال ان تین افراد کا واقعہ ہے جنہوں نے جنگ تبوک میں شرکت نہیں کی تھی۔ جنگ سے واپسی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا کہ ان سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھیں۔ اس قطع تعلق کے نتیجہ میں ان کی حالت یہ ہوگئی کہ گویا زمین اپنی تمام تر راحت کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی، یہاں تک کہ ان تینوں نے ایک دوسرے سے بھی قطع تعلق کرلیا اور توبہ میں مشغول ہوگئے۔ کچھ عرصہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کرلی اور یہ آیت نازل فرمائی:

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ حَتّٰٓي اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿١١٨﴾

''اوران تین افراد کی بھی توبہ قبول کی جو (مدینہ میں) رہ گئے تھے (اور جنگ تبوک میں شرکت نہیں کی تھی اور مسلمانوں س نے ان سے تعلق توڑ لیا تھا) یہاں تک کہ زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی۔ یہاں تک کہ ان کے اپنے دل بھی ان کیلئے تنگ ہوگئے اور وہ یہ سمجھنے لگے کہ اللہ کے سوا ان کی کوئی پناہ نہیں ہے۔ پھر اللہ نے ان پر مہربانی فرمائی تاکہ وہ توبہ کرسکیں۔ بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔'' (توبہ:۱۱۸)

ممکن ہے یہ جملہ ''وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ''، ''ان کے دل بھی ان پر تنگ ہوگئے''، معاقبہ نفس کی طرف اشارہ ہو۔ یعنی انہوں نے اپنے آپ کو سزا دینے کیلئے آپس میں ایک دوسرے سے قطع تعلق کرلیا اور مکمل تنہائی اور خلوت اختیار کرلی ہو اور اس کیفیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کرلی ہو۔

اسی طرح سورۂ توبہ کی آیت ۱۰۲ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ابولبابہ انصاری کے بارے میں نازل ہوئی۔ آیت یہ ہے:

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٠٢﴾

''اور کچھ دوسرے لوگ، جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کرلیا اور اچھے اور برے اعمال باہم مخلوط کر دیئے، امید ہے اللہ انہیں معاف کر دے گا۔ بے شک اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا

ہے۔''(توبہ:۱۰۲)

ابولبابہ ایک انصاری تھے جنہوں نے جنگ تبوک میں شرکت نہیں کی تھی۔ بعد میں سخت پشیمان ہوئے اور اپنے آپ کو مسجد نبویؐ کے ایک ستون سے باندھ لیا۔ یہ ستون اب بھی ستونِ ابولبابہ یا ستونِ توبہ کے نام سے معروف ہے۔ وہ کچھ عرصہ اس ستون سے بندھے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مندرجہ بالا آیت نازل کر کے ان کی توبہ کو قبول کرنے کا اعلان فرمایا۔

ظاہر سی بات ہے کہ ابولبابہ کا یہ اقدام ''معاقبہ'' یعنی اپنے آپ کو سزا دینا شمار ہوتا ہے۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ سیر و سلوک کا یہ قدم رسول اللہؐ کے دور میں ان کے اصحاب میں بھی رائج تھا۔

ممکن ہے آیت کا یہ جملہ ''خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَیِّئًا ؕ''(انہوں نے اچھے اور برے اعمال باہم ملا دیئے) بھی اسی طرف اشارہ کر رہی ہو۔

احادیث میں بھی معاقبہ کے بارے میں واضح بیانات پائے جاتے ہیں۔

۱۔ نہج البلاغہ میں ایک خطبہ میں امیر المومنین علیہ السلام نے متقین کی نمایاں صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

ان استصعبت علیہ نفسه فی ما تکرہ لم یعطها سولها فی ما تحب

''جب بھی اس کا نفس کسی ایسے کام کو انجام دینے میں سرکشی کرے جو اسے ناگوار گزرتا ہے (یا گناہ کی راہ پر چلتا ہے) تو وہ (یعنی متقی) بھی اس (یعنی نفس) کو اس کی پسندیدہ چیز سے محروم کر دیتا ہے (اور اس طرح اپنے سرکش نفس کو سزا دیتا ہے)۔''(نہج البلاغہ:۱۹۳)

اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک متقی انسان اپنے نفس کی سرکشی کی وجہ سے اسے نیند، اس کی پسندیدہ خوراک اور آرام وغیرہ سے محروم کر دیتا ہے تاکہ اس طرح نفس کو سزا ملے اور وہ آئندہ گناہ اور نافرمانی کی راہ پر نہ چلے۔

۲۔ غرر الحکم میں ایک حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا:

اذا صعبت علیك نفسك فاصعب لها تذل لك

''جب تمہارا نفس سخت گیری کرے (یعنی اللہ کی اطاعت میں تمہارا ساتھ نہ دے) تو تم بھی اس پر سخت گیری کرو (یعنی اسے اس کی پسندیدہ چیزوں سے محروم کر دو) تاکہ وہ تمہارا مطیع ہو جائے۔''

۳۔ حضرت علی علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں ہے:

من ذم نفسه اصلحها من مدح نفسه ذبحها

جو اپنے نفس کی مذمت کرتا ہے، وہ اس کی اصلاح کرتا ہے اور جو اس کی تعریف کرتا ہے، وہ اسے ذبح کر دیتا ہے۔(غرر الحکم)

۴۔ امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں ہے:

دواء النفس الصوم عن الهوى، والحميه عن الذات الدنيا

''سرکش نفس کی دوا خواہشات پر قابو رکھنا اور دنیوی لذتوں سے پرہیز کرنا ہے۔''(غرر الحکم: ۵۱۵)

اصحاب رسولؐ، علمائے بزرگ اور پاک دل مومنین کے حالات زندگی کا مطالعہ کریں تو ہمیں بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ انہوں نے ارتکابِ گناہ کی صورت میں اپنے نفس کو سزا دی تا کہ مستقبل میں اس گناہ کا تکرار نہ ہو۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ رسولؐ اللہ کے ایک صحابی تھے جن کا نام ثعلبہ تھا۔ وہ انصاری تھے اور انہوں نے سعید بن عبدالرحمن کے ساتھ، جو مہاجر تھے، عہد اخوت باندھا تھا۔ ایک جنگ میں سعید رسولؐ اللہ کے ساتھ گئے جبکہ ثعلبہ مدینہ میں رہے۔ سعید کو اپنے اس بھائی پر اعتماد تھا کہ وہ اس کے اہل و عیال کا خیال رکھے گا۔ وہ بھی اسی بنیاد پر ہر روز انہیں پانی، ایندھن وغیرہ فراہم کرتے تھے اور ان کی مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

ایک دن سعید کی بیوی پردے کے پیچھے سے ثعلبہ سے کسی مسئلہ کے بارے میں کوئی بات کر رہی تھی کہ ثعلبہ کی نفسانی خواہش اس پر غالب آ گئی۔ اس نے پردہ ایک طرف کر دیا اور سعید کی خوبصورت بیوی کو بانہوں میں لینے کیلئے ہاتھ آگے بڑھائے سعید کی بیوی چیخ کر بولی: ثعلبہ کیا کر رہے ہو؟ کیا یہ صحیح ہے کہ تمہارا مجاہد بھائی اللہ کی راہ میں جہاد کر رہا ہو اور تم اس کے گھر میں اس کی بیوی کے بارے میں بری نیت رکھتے ہو؟

ثعلبہ کا ضمیر اچانک بیدار ہو گیا۔ وہ سعید کے گھر سے نکل کر صحرا کی طرف نکل گیا اور گریہ وزاری میں مشغول ہو گیا اور اللہ تعالیٰ سے اس طرح معافی مانگنے لگا:

الهى انت المعروف بالغفران وانا الموصوف بالعصيان

''اے میرے معبود! تو مغفرت کی وجہ سے معروف ہے جبکہ میں نافرمانی سے موصوف ہوں۔''

اس طرح اس نے اپنے اس گناہ کی وجہ سے سختی کی اور آخرکار آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا ماجرا آپؐ سے بیان کیا اور اپنی توبہ آپؐ کی خدمت میں پیش کی۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران کی آیت ۱۳۵ نازل فرمائی:

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۠ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

''جب وہ کسی برے کام کے مرتکب ہوتے ہیں یا اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں، اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا کون گناہوں کو معاف کرنے والا ہے۔ اور پھر وہ دانستہ

اپنے کئے ہوئے گناہ پر اصرار نہیں کرتے۔"[1]

۲۔ آیت اللہ بروجردی مرحومؒ کے بارے میں نقل کیا گیا ہے کہ بعض اوقات دورانِ درس کسی شاگرد سے سختی سے بات کرجاتے تھے۔ اگرچہ یہ ایک پدرانہ سختی ہوتی تھی مگر وہ اس پر اپنے شاگرد سے معافی طلب کرتے تھے اور جیسا کہ انہوں نے منت مانی ہوئی تھی، اس سے اگلے دن روزہ رکھ کر اپنے نفس کو سزا دیتے تھے۔

۳۔ علمائے اخلاق میں سے ایک بزرگ عالم نے ایک خطیب کا واقعہ بیان کیا کہ وہ کہا کرتے تھے کہ میں منبر پر جاتے وقت امام حسین علیہ السلام کو سلام کرتا ہوں اور ان کا جواب سنتا ہوں۔ اگر ان کی طرف سے جواب نہ آئے تو منبر پر نہیں جاتا اور تقریر نہیں کرتا۔ میری یہ روحانی حالت اس طرح حاصل ہوئی کہ ایک بار میں ایک بہت بڑی اور اہم مجلس میں گیا۔ ایک بہت مشہور خطیب تقریر کررہے تھے۔ میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کے بعد ایسی تقریر کروں جس سے اس کی دلکش تقریر کا اثر ختم ہوجائے۔ لیکن بعد میں مجھے احساس ہوا کہ یہ بہت ہی برا خیال تھا جو میرے دل میں آیا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ اپنے نفس کو سزا دینے کیلئے چالیس دن تک کوئی تقریر نہیں کروں گا۔ اس معاقبہ نفس کے نتیجہ میں میرے دل میں یہ نورانیت پیدا ہوگئی کہ امام حسین علیہ السلام کو سلام کرتا ہوں تو ان کا جواب سنتا ہوں۔

مختصر یہ کہ مراقبہ اور محاسبہ کا فیصلہ کن اثر صرف اس صورت میں ظاہر ہوتا ہے جب ان کے بعد معاقبہ اور مناسب سزا کا بھی انتظام ہوتا کہ نفس امارہ کو اس کی سرکشی سے باز رکھا جاسکے، ورنہ مراقبہ اور محاسبہ کی تاثیر بہت کمزور ہوگی۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم جوگیوں اور بھٹکے ہوئے صوفیاء کے طرزِ عمل کو صحیح جاننے لگیں اور ان واقعات کی تصدیق کرنے لگیں جو غزالی نے احیاء العلوم میں بیان کئے ہیں جن سے یہ درس ملتا ہے کہ انسان اپنے نفس کی خطاؤں پر اسے خطرناک اور احمقانہ قسم کی سخت سزائیں دے۔ معاقبہ کے صحیح معنی یہ ہیں کہ انسان روزہ رکھ کر، یا نفس کی پسندیدہ حلال لذتوں سے اسے محروم کرکے اسے مناسب سزا دے۔

مرحوم نراقی ''معراج السعادۃ'' میں لکھتے ہیں:

اگر انسان سے کوئی غلط کام سرزد ہوجائے تو وہ اپنے آپ کو سزا دے، مثلاً کوئی سنگین عبادت انجام دے یا اپنے اموال میں سے کوئی پسندیدہ چیز اللہ کی راہ میں خیرات کرے۔ اگر اس نے حرام یا مشکوک غذا کا لقمہ کھایا ہو تو اپنے نفس پر بھوک مسلط کرے۔ اگر کسی کی غیبت کی ہو تو اس کی تعریف کرکے یا اپنے نفس پر خاموشی کو مسلط کرکے اپنے آپ کو سزا دے یا ذکر خدا سے اس کی تلافی کرے۔ اگر اس نے کسی فقیر یا تنگدست کی تحقیر کی ہو تو اسے بھاری مقدار میں مال دے اور اسی طرح دیگر گناہوں اور لغزشوں کی تلافی کرے۔

---

[1] یہ واقعہ مختلف کتب میں تفصیل کے ساتھ ''خزینۃ الجواہر، ص ۳۲۰ سے نقل کیا گیا ہے۔ فخر رازی نے تفسیر کبیر، ج ۹، ص ۹ میں اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔

نیت اور اخلاصِ نیت

بہت سے علمائے اخلاق نے اخلاقی مباحث کے آغاز میں نیت اور اخلاصِ نیت کے بارے میں گفتگو کی ہے اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ اور جدا قرار دیا ہے۔ یعنی ان کے نزدیک نیت اور چیز ہے اور اخلاصِ نیت اور چیز ہے لیکن مقام بحث میں انہوں نے ان کے فرق کو واضح نہیں کیا۔

ان دونوں کے فرق کو واضح کرنے کیلئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نیت سے مراد کسی کام کو کرنے کا عزمِ راسخ اور پختہ ارادہ ہے، خواہ اس کام کو انجام دینے کا محرک الٰہی ہو یا مادی۔

ظاہر سی بات ہے کہ کوئی بھی کام اسی صورت میں نتیجہ بخش ہوسکتا ہے جب مضبوط ارادے اور پختہ عزم کے ساتھ انجام دیا گیا ہو۔ حصولِ علم، تجارت، زراعت، پیداواری سرگرمیاں، معاشرتی اور سیاسی سرگرمیاں اور ہر کام صرف اسی صورت میں نتیجہ بخش اور مفید ہوتا ہے جب اسے تذبذب اور دودلی کے ساتھ نہیں بلکہ یقین اور یکسوئی کے ساتھ انجام دیا گیا ہو۔ ایسا اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ انسان اس کام کو انجام دینے سے قبل اس کے تمام پہلوؤں کا اچھی طرح سے جائزہ لے۔ اس کام کی پیشرفت کی ضروری شرائط اور پیش آنے والی ممکنہ رکاوٹوں سے آگاہ ہو، پھر مضبوط ارادے کے ساتھ میدان میں اترے اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بڑھے۔

تہذیب اخلاق اور سیر وسلوک الی اللہ کیلئے بھی پختہ اور دوٹوک ارادہ ضروری ہے۔ کمزور، سست اور کاہل افراد ہرگز اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتے بلکہ معمولی سی رکاوٹ کا سامنا کرنے پر رک جاتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کمزور ارادہ انسان کی طاقت کو بھی کمزور کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس قوی ارادہ انسان کی تمام اندرونی صلاحیتوں کیلئے مہمیز ثابت ہوتا ہے اور انسان کو اس کی منزلِ مقصود کی طرف حرکت میں لے آتا ہے۔

قرآن مجید میں اسی چیز کو عزم کا نام دیا گیا ہے اور اللہ کے بڑے انبیاء کو اسی وجہ سے اولوالعزم کہا گیا کہ ان کے ارادے بہت بلند اور پختہ تھے۔

قرآن مجید میں رسول اللہ کو حکم دیا گیا:

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾

''ہم نے آدمؑ سے عہد لیا تھا (کہ شجرۂ ممنوعہ کے قریب نہ جانا) لیکن وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہیں پایا۔'' (طہٰ:۱۱۵)

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے منقول ماہِ رجب کی ایک دعا میں ہے:

وقد علمت ان افضل زادالراحل اليك عزم ارادة يختارك بها و قدناجاك

بعزم الارادة قلبی

''میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تیری طرف آنے والوں کا بہترین زادِسفر پختہ ارادہ ہے جس سے وہ تجھے اختیار کرتا ہے اور میرا دل پختہ ارادے سے تجھ سے مناجات کر رہا ہے۔''

(مفاتیح الجنان، اعمال ماہِ رجب)

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

انما قدر الله عون العباد علی قدر نیاتهم فمن صحت نیته تم عون الله له، و من قصرت نیته قصر عنه العون بقدر الذی قصره

''اللہ تعالیٰ بندوں کی نیت کے حساب سے ان کی مدد کرتا ہے، جس کی نیت صحیح ہو، اللہ اس کی پوری مدد کرتا ہے، جس کی نیت ناقص ہو، اللہ تعالیٰ اس کی نیت کے مطابق اس کی مدد کرتا ہے۔''

(بحارالانوار، ٦٧:٢١١)

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ما ضعف بدن عما قویت علیه النیة

''جس کام کی نیت مضبوط ہو، بدن اس پر سست اور ناتوان نہیں ہوتا۔'' (بحارالانوار، ٦٧:٢٠٥)

اس حدیث سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ پختہ عزم اور ارادہ انسان کی جسمانی طاقت کو بھی زیادہ کرتا ہے اور اسے قوت اور حوصلہ بخشتا ہے۔

نیت کے ایک اور معنی

اس میں محرک کا فرق ہے۔ ممکن ہے چند افراد ایک ہی کام کر رہے ہوں، مثلاً جہاد میں شریک ہوں، ایک کا محرک مالِ غنیمت کا حصول یا برتری طلبی ہو جبکہ دوسرے کا محرک حق کی مدد کرنا، ظلم کا خاتمہ کرنا اور فتنہ کی آگ کو بجھانا ہو۔

ان دونوں افراد کا عمل ظاہری شکل میں ایک جیسا ہے، دونوں میدانِ جنگ میں جا کر دشمن کے خلاف جنگ کرتے ہیں لیکن دونوں کی حیثیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسی لیے اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے کہ ابتدائے کار میں انسان اپنی نیت کو واضح کر لے۔

سالکانِ راہِ خدا بھی بڑی باریک بینی سے اپنی نیت کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ آیا ان کا مقصد اصلاحِ نفس، اخلاقی ارتقاء اور قربِ خدا کی منزل تک پہنچنا ہے یا لوگوں پر اپنی برتری کا سکہ جمانے کیلئے کرامات حاصل کرنا ہے!

مشہور حدیث "انما الاعمال بالنیات" کا اشارہ بھی اسی حقیقت کی طرف ہے جو کہ حدیث کے ذیل سے واضح ہو جاتا ہے۔

اس بارے میں حضرت رسولؐ خدا نے فرمایا:

انما الاعمال بالنیات و انما لکل امرء مانوی فمن کانت هجرته الی الله و رسوله فهجرته الی الله و رسوله ومن کان هجرته الی دنیا یصیبها او امراة یتزوجها فهجرته الی ماهاجر الیه

''اعمال کی قدر و قیمت کا دار و مدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کو وہی کچھ ملے گا جس کی اس نے نیت کی۔ جس نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسولؐ ہی کی طرف محسوب ہوگی اور جس کی ہجرت حصولِ دنیا کی خاطر یا کسی عورت سے شادی کی خاطر ہو تو اس کی ہجرت اسی کی طرف محسوب ہوگی جس کی طرف اس نے ہجرت کی۔'' (بحار الانوار ۶۷:۲۱۱)

ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

علی قدر النیة تکون من الله عطیة

''اللہ کی عطا انسان کی نیت کے حساب سے ہوتی ہے۔'' (غرر الحکم، حدیث ۱۵۹۴)

مندرجہ بالا بحث سے بخوبی یہ نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے کہ ہر کام میں کامیابی کیلئے عزم راسخ، مستحکم نیت اور قوت ارادی اشد ضروری ہے۔ جب تک یہ حاصل نہ ہو، انسان کی تمام کوششیں لاحاصل یا کم حاصل رہیں گی۔

جو لوگ اصلاحِ نفس اور تہذیب اخلاق کی راہ میں قدم بڑھانا چاہتے ہیں، وہ بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ ان پر بھی لازم ہے کہ فولادی عزم اور آہنی ارادے سے اپنے کام کا آغاز کریں اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے آگے بڑھیں۔

یہاں یہ سوال پیش آ سکتا ہے کہ مذکورہ بالا قوتِ ارادی کو کس طرح حاصل کیا جائے؟

اس سوال کا جواب واضح ہے۔ اس قوتِ ارادی کے حصول کا اصل راستہ یہ ہے کہ انسان اپنے کام کے نتائج اور مقصد کی عظمت کی طرف توجہ کرے اور ان کے بارے میں غور و فکر کرے۔ جس قدر ان معاملات میں انسان کی سوچ اور تجزیہ وسیع ہوگا اور وہ مقصد کی اہمیت کو اچھی طرح پہچانتا ہوگا، اسی قدر مضبوط قوتِ ارادی سے اس راہ میں قدم اُٹھائے گا۔

جب انسان یہ سوچے کہ اس کے وجود کی قدر و قیمت اس کی اخلاقی صفات پر منحصر ہے اور یہ کہ انسان کی خلقت کا مقصد اخلاقی ارتقاء اور قربِ خدا کے سوا کچھ نہیں ہے، اگر وہ اس اہم ہدف سے غفلت کرے گا تو اس کی ہلاکت کا سفر شروع ہو جائے گا۔ انسان جس قدر ان حقائق کے بارے میں باریک بینی اور موشگافی سے کام لے گا، اسی قدر پختہ عزم اور ارادے سے اس راہ میں قدم

اُٹھائے گا۔

ایک جملے میں اس بات کواسی طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ پختہ ارادے،مقصد کی مکمل معرفت اوراس کی طرف مکمل توجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

اخلاص

اخلاص سے مراد خلوصِ نیت ہے اور خلوصِ نیت کے معنی یہ ہیں کہ کسی بھی کام کے فیصلے کے پیچھے اصل محرک صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہو۔

ممکن ہے بعض لوگ کسی کام کوانجام دینے کا پختہ عزم اور محکم ارادہ رکھتے ہوں لیکن ان کا محرک مادی ہو۔لیکن سالکانِ راہِ خدا کا عزم اورارادہ خلوصِ نیت کے ساتھ جڑا ہوا ہوتا ہےاوران کے ہر کام کا محرک الٰہی ہوتا ہے۔

قرآنی آیات اوراحادیث میں کسی چیز کواتنی اہمیت نہیں دی گئی،جتنی اخلاصِ نیت کو دی گئی ہے۔قرآن مجیداوراحادیثِ معصومینؑ میں جگہ جگہ اخلاصِ نیت کا ذکر ملتا ہےاوراسے دنیااورآخرت کی کامیابی کا بنیادی عامل قرار دیا گیا ہے۔اصولی طور پراسلام کی نظر میں اس عمل کی کوئی قدرو قیمت نہیں ہے جس میں اخلاص نیت نہ ہو۔

دوسری طرف سے ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اخلاصِ نیت کے حصول کومشکل ترین کام قرار دیا گیا ہے۔اس قدر مشکل کہ صرف اللہ کے اولیاءاور بندگانِ خاص ہی اخلاصِ کامل کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں،اگر چہ اخلاص نیت کا ہر درجہ اپنے مقام پر پسندیدہ ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر پہلے ہم اخلاص نیت سے متعلق قرآنی آیات کا جائزہ لیں۔قرآن مجید کی متعدد آیات میں مخلصین (خالص ہونے والے) یامخلصین (جوخالص ہو چکے ہیں) کے بارے میں بات کی گئی ہےاور مختلف الفاظ میں ان کی تعریف وستائش کی گئی ہے:

۱۔ وَمَآ اُمِرُوۡٓا اِلَّا لِيَعۡبُدُوا اللّٰهَ مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤۡتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيۡنُ الۡقَيِّمَةِ۝

''انہیں اس کے سوااور کسی چیز کا حکم نہیں دیا گیا کہ اپنے دین کواللہ کیلئے خالص کرتے ہوئے یکسوئی سے اس کی عبادت کریں،نماز قائم کریں اورزکوٰۃ ادا کریں،یہی پائیداردین ہے۔'' (بینہ:۵)

اس حقیقت کے پیش نظر کہ دین کا مفہوم بہت وسیع ہے،اس میں تمام عقائدواعمال آجاتے ہیں اوراس حقیقت کے پیش نظر کہ ''مآامروا''میں ضمیر غائب تمام آسمانی مذاہب کے پیروکاروں کی طرف لوٹتی ہے،اوراس چیز کے پیش نظر کہ اخلاص،نماز اورزکوٰۃ کا حکم ان سب کو دیا گیا ہے،مسئلہ اخلاص کی اہمیت مکمل طور پرواضح ہوجاتی ہے۔اس تعبیر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام احکامِ الٰہی کی بنیاد توحیداوراخلاص کی حقیقت پر رکھی گئی ہے۔

۲۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ﴿۱۴﴾ (مومن: ۱۴)

''اپنے دین کو اللہ کیلئے خالص کرتے ہوئے صرف اللہ کو پکارو خواہ یہ کافروں کو ناگوار گزرے۔''

۳۔ ایک اور مقام پر رسولؐ اللہ کو حکم دیا گیا ہے:

قُلْ اِنِّيْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ﴿۱۱﴾

''اے رسولؐ! کہہ دو کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اپنے دین کو اللہ کیلئے خالص کرتے ہوئے اس کی عبادت کروں۔'' (زمر: ۱۱)

ان آیات اور ان جیسی دیگر متعدد آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اخلاص دین کا بنیادی رکن ہے، اس کے علاوہ مخلصین یا مخلصین کے بارے میں اس سے بھی زیادہ اہم عبارات نظر آتی ہیں۔

۱۔ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ﴿۳۹﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ﴿۴۰﴾

تیرے مخلص بندوں کے علاوہ ان سب کو بہکاؤں گا۔ (حجر۔ ۳۹۔ ۴۰)

یہ بات شیطان نے اس وقت کہی تھی جب اس ے بارگاہ قرب الٰہی سے دھتکارا گیا تھا۔ اس آیت سے بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہ اللہ کے مخلص بندوں کی حالت اس قدر مضبوط ہے کہ شیطان کو بھی اس کے گمراہ نہ ہونے کا یقین۔

۲۔ وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴿۳۹﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ﴿۴۰﴾

''تمہیں وہی صلہ دیا جائے گا جو عمل تم کرتے رہے، سوائے اللہ کے مخلص بندوں کے۔''
(صافات۔ ۳۹۔ ۴۰)

اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق صلہ ملے گا مگر مخلصین کو بے حساب اجر و نعمت سے نوازا جائے گا۔

۳۔ اس طرح سورۂ صافات ہی کی آیات ۲۷ اور ۲۸ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مخلصین اللہ کی بارگاہ میں پیش ہونے سے معاف ہوں گے اور امید ہے جنت کی طرف روانہ کر دیئے جائیں گے۔

۴۔ اسی سورت کی آیات ۱۵۹ اور ۱۶۰ میں اللہ کو لوگوں کی بیان کردہ صفات سے پاکیزہ و منزہ قرار دیا گیا ہے مگر مخلصین کی بیان کردہ توصیف کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے:

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ﴿۱۶۰﴾

''اللہ ان کی بیان کردہ صفات سے منزہ ہے، سوائے اللہ کے مخلص بندوں کے۔''

(صافات:۱۵۹،۱۶۰)

۵۔ سورۂ یوسف کی آیت ۲۴ میں عزیز مصر کی بیوی کے وسوسوں کے مقابلہ میں حضرت یوسفؑ کی حمایت کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں کیا:

كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۝۲۴

''اس طرح ہم نے بدی اور فحشاء کو اس سے پھیر دیا۔ بے شک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا۔''

مخلص اور مخلَص کا فرق بیان کرنے کے لئے بہت سی باتیں کہی گئی ہیں لیکن شاید ان میں سے بہترین تفسیر یہ ہے کہ مخلص سے مراد وہ افراد ہیں جو اپنے آپ کو خالص بنانے کے مراحل میں سے گزر رہے ہیں جبکہ مخلَص سے مراد وہ افراد ہیں جو اپنے آپ کو خالص بنانے کا عمل مکمل کر کے ہر لحاظ سے مکمل طور پر خالص ہو چکے ہیں۔

یہاں پر اس نکتہ کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ انسان کے اندر پائی جانے والی آلائشات کی دو اقسام ہیں:

ایک وہ آلائشات جن سے انسان آگاہ ہوتا ہے اور ان کو برطرف کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے عقیدہ و عمل کو خالص بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

آلائشات کی دوسری قسم اس قدر مرموز اور پوشیدہ ہوتی ہے کہ اول تو انسان ان کو پہچان ہی نہیں سکتا اور اگر انہیں پہچان لے تو انہیں برطرف کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔ رسولؐ اللہ سے مروی ایک مشہور حدیث میں ہے:

ان الشرك اخفى من دبيب النمل على صفاة سوداء في ليلة ظلماء

(بحارالانوار:۶۹:۹۳)

''شرک تاریک رات میں سیاہ پتھر پر چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ مخفی چال چلتا ہے۔''

اگر اللہ تعالیٰ کا لطف ایسے حالات میں سالک کے شاملِ حال نہ ہو تو وہ ان دشوار مراحل سے کبھی نہ گزر سکے اور آلائشات میں پھنسا رہ جائے گا۔ لیکن جو لوگ اپنی طاقت، توانائی اور دائرۂ اختیار سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کر کے اپنے آپ کو حتی الامکان خالص بنانے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں اس کا یہ انعام دیتا ہے کہ باقی ماندہ راستے کو وہ اس کی توفیق و عنایت سے طے کر لیتے ہیں اور مخلَص سے مخلَص ہو جاتے ہیں۔

جب انسان اس مرحلہ پر پہنچ جائے ہیں تو شیاطین کے وسوسوں اور ہوائے نفس کے شر سے مکمل طور پر محفوظ ہو جاتا ہے۔ شیطان ایسے انسانوں سے مایوس ہو جاتا ہے اور باقاعدہ طور پر ان کے سامنے ہار مان لیتا ہے۔

اس مقام پر سالک اللہ تعالیٰ کی نعمت کے وسیع دسترخوان سے بے حساب بہرہ مند ہوتا ہے۔ اللہ کے جلال اور جمال کے بارے میں ان کی توصیف پر خالص توحید کا رنگ چڑھا ہوا ہوتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ وہ جنت میں بھی بغیر حساب کتاب کے جاتا

ہے، اس لئے کہ دنیا میں ہی وہ اپنا حساب صاف کر چکا ہوتا ہے۔

نہج البلاغہ میں امیر المومنین علیہ السلام نے اس حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

قد اخلص للہ فاستخلص

''اس نے اپنے آپ کو اللہ کے لئے خالص کیا اور اللہ نے اس کے خلوص کو قبول کر لیا (اور اسے مرحلہ کمال تک پہنچا دیا)۔'' (خطبہ: ۸۷)

اسی بناء پر ایک حدیث میں رسولؐ اللہ کے بارے میں ہے: (بحار الانوار، ۱۴: ۵۲۰)

فعند ذلك استخلص الله عزوجل لنبوته و رسالته من الشجرة المشرفة الطيبة .... محمدا اختصه للنبوة و اصطفاه بالرسالة

''اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنی نبوت اور رسالت کیلئے حضورؐ کو پاکیزہ شجر سے چن لیا۔''

آئمہ معصومینؑ سے مروی ایک اور حدیث میں ہے:

وجدت ابن آدم بين الله و بين الشيطان فان احبه الله تقدست اسمائه خلصه و استخلصه و الا خلى بينه و بين عدوه (بحار الانوار، ۵: ۵۵)

''میں نے فرزندِ آدم کو اللہ اور شیطان کے درمیان پایا ہے۔ اگر اللہ (اس کے کردار کی وجہ سے) اس سے محبت کرتا ہو تو اسے خالص و مخلص بنا دیتا ہے، ورنہ اسے شیطان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔''

مختصر یہ کہ نیت، عقیدہ، اخلاق اور عمل میں اخلاص پیدا کرنا تہذیب نفس اور سیر و سلوک الی اللہ کے اہم ترین اور اساسی ترین مراحل میں سے ایک ہے۔

اخلاص احادیث کی روشنی میں

اخلاص کے بارے میں احادیث میں بھی مفصل بحث کی گئی ہے جس کے بعض پہلوؤں کا ہم ذیل میں جائزہ لیتے ہیں:

۱۔ ایک حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں: (محجۃ البیضاء، ۸: ۱۲۵۔ خصال، باب الثلاثۃ: ۱۶۷)

ثلاث لا يغل عليهن قلب رجل مسلم اخلاص العمل لله عزوجل و النصيحة لائمة المسلمين و اللزوم لجماعتهم

''تین چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں کسی مسلمان کے دل میں خیانت نہیں پائی جانی چاہئے: عمل کو اللہ کے خالص کرنا، مسلمان حکام کی خیرخواہی اور جماعت مسلمین کے ساتھ رہنا۔''

۲۔ ایک اور حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

الاخلاص سر من اسراری استودعه قلب من احببته من عبادی

''اخلاص میرے رازوں میں سے ایک راز ہے جسے میں اپنے اس بندے کے قلب میں ڈالتا ہوں جس سے میں محبت کرتا ہوں۔'' (محجۃ البیضاء:۸:۱۲۵)

۳۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

الاخلاص اشرف نهاية

''اخلاص اشرف ترین انجام ہے۔'' (تصنیف الغرر:۱۹۷)

۴۔ ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں:

الاخلاص اعلی الایمان

''اخلاص ایمان کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔'' (غرر الحکم:۱:۱۲۵)

۵۔ امیر المومنین علیہ السلام سے ہی ایک اور حدیث میں ہے:

فی اخلاص الاعمال تنافس اولوا النهی والالباب

''اہل عقل وخرد اعمال کے اخلاص میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہیں۔'' (غرر الحکم، ۲:۵۱۳)

۶۔ ایک حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

بالاخلاص تتفاضل مراتب المومنین

''مومنین کی درجہ بندی اخلاص کے درجات کی بنیاد پر ہوگی۔'' (میزان الحکمہ، ۱:۳۰)

۷۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

غاية اليقين الاخلاص

''اخلاص یقین کا آخری درجہ ہے۔'' (غرر الحکم:۲)

۸۔ رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

اخلص قلبك يكفك القليل من العمل

''اپنے دل کو خالص کرلو تو تمہارا قلیل عمل بھی کافی ہے۔'' (بحار الانوار، ۷۰:۱۷۵)

۹۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

الاخلاص عبادة المقربين

''اخلاص مقربین کی عبادت ہے۔'' (غرر الحکم،۱:۲۵)

۱۰۔ ہم اس مفصل بحث کو امیر المومنین علیہ السلام کی اس حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں:

طوبی لمن اخلص الله العبادة و الدعاء و لم یشغل قلبه بما تری عیناه ولم ینس ذکر الله بما تسمع اذناه ولم یحزن صدره بما اعطی غیره

''خوش نصیب ہے وہ شخص جو اپنی عبادت اور دعا کو اللہ کیلئے خالص کرے اور اپنے دل کو ان چیزوں میں مشغول نہ کرے جو اس کی آنکھیں دیکھتی ہیں۔ جو کچھ اس کے کان سنتے ہیں، اس کی وجہ سے اللہ کے ذکر کو فراموش نہ کرے اور جو کچھ دوسروں کو دیا گیا ہے، اس پر اس کا دل غمگین نہ ہو۔''

(اصولِ کافی)

اخلاص کی حقیقت

مرحوم فیض کاشانی محجۃ البیضاء میں اس بارے میں کہتے ہیں:

''اخلاص کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کی نیت ہر قسم کے شرکِ مخفی اور شرکِ جلی سے پاک ہو۔''

قرآن مجید میں ہے:

وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۖ نُّسْقِيكُم مِّمَّا فِي بُطُونِهِ مِن بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِّلشَّارِبِينَ ﴿٦٦﴾

''چوپایوں میں تمہارے لئے درس عبرت ہے، اس لئے کہ ہم ان کے پیٹ میں سے ہضم شدہ خوراک اور خوراک کے درمیان سے تمہیں خالص اور لذیذ دودھ پلاتے ہیں۔'' (نحل:٦٦)

خالص دودھ وہ ہوتا ہے جو خون کے دھبوں، اندرونِ شکم کی آلائشات اور دیگر آلودگیوں سے پاک ہو۔ خالص نیت اور خالص عمل بھی وہی ہوتا ہے جس میں کسی قسم کی آلائش نہ ہو۔'' (محجۃ البیضاء،۸:۱۲۸)

احادیث میں بھی اخلاص کی حقیقت اور مخلصین کی نشانیوں کے بارے میں نہایت لطیف بیانات پائے جاتے ہیں:

۱۔ ایک حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

ان لکل حق حقیقة و ما بلغ عبد حقیقة الاخلاص حتی لایحب ان یحمد علی شیء من عمل لله (بحارالانوار،٦٩:٣٠٤)

''ہر حقیقت کی ایک علامت ہوتی ہے۔کوئی شخص اس وقت تک اخلاص کی حقیقت کو نہیں پا سکتا جب تک اس کی حالت یہ نہ ہو جائے کہ وہ اللہ کیلئے کئے گئے اعمال پر اپنی تعریف کو پسند نہ کرے۔''

۲۔ ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

اما علامة المخلص فاربعة، یسلم قلبه، وتسلم جوارحه، وبذل خیره و کف شره (تحف العقول:۱۶)

''مخلص کی چار نشانیاں ہیں: اس کا دل اللہ کے حضور جھکا ہوا ہوتا ہے، اس کے اعضاء اللہ کے حکم کے سامنے جھکے ہوئے ہوتے ہیں، لوگوں کو اس سے خیر نصیب ہوتی ہے اور اپنی برائی کو روکے رکھتا ہے۔''

۳۔ ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

لایکون العبد عابد الله حق عبادته حتی ینقطع عن الخلق کله الیه، فحینئذ یقول هذا خالص لی فیتقبله بکرمه

''کوئی عابد اللہ کی عبادت کا حق ادا نہیں کر سکتا جب تک مخلوق سے منقطع ہو کر مکمل طور پر اللہ کی طرف متوجہ نہ ہو جائے۔ جب وہ ایسا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرے لئے خالص ہو چکا ہے۔ پس وہ اپنے کرم سے اسے قبول کر لیتا ہے۔'' (مستدرک الوسائل،۱:۱۰۱)

۴۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ما انعم الله عزوجل علی عبد اجل من ان لایکون فی قلبه مع الله غیره (مستدرک الوسائل،۱:۱۰۱)

''کسی بندے پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ اس کے دل میں اللہ کے ساتھ اور کوئی نہ ہو۔''

اخلاص کی غیر معمولی اہمیت اور راہِ حق پر چلنے اور قربِ الٰہی کے اعلیٰ مقامات تک پہنچنے میں اس کی گہری تاثیر کے بارے میں آ گاہی حاصل کر لینے کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اخلاص کو کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ اخلاص نیت، ایمان، یقین اور معرفت الٰہی کی گہرائی سے جنم لیتا ہے۔ انسان کا توحید افعالی پر جس قدر زیادہ یقین ہو گا اور وہ عالم ہستی میں اللہ کے سوا کسی کو موثر نہ سمجھے، ہر چیز کو اسی کی طرف سے اور اس کے حکم کے تابع سمجھے، حتیٰ کہ اسباب وعوامل کو بھی اس کا مطیع اور محکوم جانے تو ایسے شخص کے تمام اعمال خلوص پر مبنی ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے تمام کاموں کا مبداء موثر صرف اللہ تعالیٰ کو سمجھتا ہے۔

یہ حقیقت احادیث میں بھی مختصر اور مؤثر انداز میں بیان کی گئی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

الاخلاص ثمرة اليقين

''اخلاص یقین کا پھل ہے۔''(غرر الحکم،۱:۳۰)

چونکہ "واعبد ربك حتى یاتیك الیقین"(اپنے رب کی عبادت کرو، یہاں تک کہ تمہیں یقین آ جائے) کی رو سے عبادت اسباب یقین میں سے ہے، اسی لئے حضرت علیؑ ایک اور ارشاد میں فرماتے ہیں:

الاخلاص ثمرة العبادة

''اخلاص عبادت کا ثمر ہے۔''(غرر الحکم:۱:۱۷۱)

چونکہ علم معرفت یقین کے ذرائع میں سے ہیں اور یقین اخلاص کا سرچشمہ ہے، ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

ثمرة العلم اخلاص العمل

''علم کا ثمر اخلاصِ عمل ہے۔''(غرر الحکم،۱:۳۶۱)

آخر میں ہم مولا علی علیہ السلام کا ایک جامع فرمان نقل کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں جس میں اخلاص کے سرچشموں کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

اول الدین معرفته و کمال معرفته التصدیق به، و کمال التصدیق به توحیده و کمال توحیده الاخلاص له

''دین کا آغاز اللہ کی معرفت ہے، اس کی معرفت کا کمال اس کی ذاتِ مقدس کی تصدیق ہے، اس کی تصدیق کا کمال توحید ہے اور اس کی توحید کا کمال یہ ہے کہ انسان اس کیلئے خالص ہوجائے۔''

(نہج البلاغہ، خطبہ ۱)

اخلاص کی راہ میں رکاوٹیں

علم اخلاق کے علمائے بزرگ نے اس بارے میں واضح اور لطیف نکات بیان کئے ہیں۔ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ اخلاص کی راہ میں بہت سی خفیہ اور آشکار رکاوٹیں موجود ہیں جن میں سے بعض بہت قوی اور خطرناک جبکہ بعض نسبتاً کمزور ہوتی ہیں۔ شیطان اور ہوائے نفس بھی انسان کے ذہن کو آلودہ کرنے اور اخلاص کی بجائے اعمال کو ریا کاری کی آلائشات سے آلودہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ریا کاری اور آلودگی نیت کے بعض درجات تو اس قدر واضح اور آشکار ہوتے ہیں کہ ہر انسان انہیں پہچان سکتا ہے، مثلاً

شیطان کسی نمازی سے یہ کہے کہ نماز آہستہ آہستہ اور خشوع وخضوع سے پڑھ تا کہ حاضرین تجھے ایک صالح مومن سمجھیں اور کبھی تیری غیبت اور بدگوئی نہ کریں۔ یہ نہایت ہی واضح شیطانی فریب ہے۔

بعض اوقات یہ شیطانی وسوسہ نسبتاً پوشیدہ شکل میں ہوتا ہے اور اطاعت کی صورت میں سامنے آتا ہے، مثلاً وہ انسان سے کہتا ہے کہ تم ایک نمایاں اور ممتاز شخصیت ہو۔ اگر تم اپنی نماز اور دیگر اعمال کو خوبصورت اور پرکشش بنالو تو لوگ تمہارے پیچھے نماز پڑھنے لگیں گے۔ اس طرح تم ان کے ثواب میں بھی شریک ہوجاؤ گے۔ انسان آسانی سے اس وسوسے کا شکار ہوکر ریاکاری کے ہولناک گڑھے میں جا گرتا ہے۔

بعض اوقات شیطان کا وسوسہ اس سے بھی زیادہ پوشیدہ ہوتا ہے، مثلاً یہ کہ شیطان کسی نماز گزار سے یہ کہے کہ مخلص انسان وہ ہوتا ہے جو خلوت اور جلوت میں ایک جیسا ہے، جس کی عبادت خلوت میں کم اور جلوت میں زیادہ ہو، وہ ریاکار ہوتا ہے۔ اس طرح شیطان اسے اس بات پر اکساتا ہے کہ خلوت میں بھی اچھی طرح نماز پڑھے تا کہ جلوت میں اچھی طرح نماز پڑھے تو ریاکاری شمار نہ ہو اور اپنے مقاصد بھی حاصل کرسکے۔ یہ ایک انتہائی خفیہ ریاکاری ہے اور ممکن ہے کہ زیادہ تر لوگ اس سے غافل رہیں۔ اسی طرح اس سے زیادہ خفیہ اور مرموز قسم کی ریاکاری بھی ممکن ہے۔ (محجۃ البیضاء، ۸: ۱۳۳)

سچ تو یہ ہے کہ اخلاص کے موانع اس قدر زیادہ، پیچیدہ اور مخفی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کے پاس پناہ لئے بغیر ان سے بچنا ممکن نہیں ہے۔

احادیث میں بھی اخلاص کے موانع کے بارے میں جس انداز سے خبردار کیا گیا ہے، وہ بہت اہم اور قابل ذکر ہے۔

ایک حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

كيف يستطيع الاخلاص من يغلبه الهوى

''جس کی ہوائے نفس اس پر غالب ہو، وہ کیسے اخلاص پر قادر ہوسکتا ہے!'' (غرر الحکم، ۲: ۵۵۳)

اس حدیث میں اخلاص کے حصول کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہوائے نفس اخلاص تک لے جانے والے راستوں کو تاریکیوں سے پر کردیتی ہے۔

ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

قلل الامال تخلص لك الاعمال

یعنی ''اپنی آرزوؤں کو چھوٹا کردو، تمہارے اعمال میں اخلاص پیدا ہوجائے گا۔'' (غرر الحکم: ۲۹۰۶)

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ بعض اوقات انسان شیطان کے عجیب وغریب اور فریب کارانہ وسوسوں کا شکار ہوجاتا ہے، مثلاً شیطان اسے کہتا ہے کہ نمازِ جماعت میں شرکت نہ کرو کیونکہ ممکن ہے لوگوں کے سامنے عبادت کرنے سے تمہاری نیت ریاکاری سے آلودہ نہ ہوجائے۔ لہٰذا گھر پر ہی نماز پڑھا کرو اور اگر کبھی لوگوں کے سامنے نماز پڑھنی پڑھے تو اس میں سے مستحب اعمال کو ساقط کردو

اور نماز کو جلدی جلدی ادا کرو تا کہ ریا کاری میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بہت سے لوگ اسی طرزِ فکر کی وجہ سے مستحب اعمال مؤکدہ بھی ترک کر دیتے ہیں۔

شاید اسی وجہ سے قرآن مجید پوشیدہ اور آشکارا انفاق کرنے کا حکم دیتا ہے:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

''وہ اپنے اموال رات میں اور دن کو پوشیدہ و اعلانیہ انفاق کرتے ہیں۔ ان کا اجر ان کے رب کے ہاں ہے اور ان پر کوئی خوف اور حزن نہ ہوگا۔'' (بقرہ: ۲۷۴)

ایک اور نکتہ کا ذکر کر کے ہم اس بحث کو یہاں ختم کرتے ہیں۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ تنہائی اور خلوت میں اخلاص کا ہونا کوئی اہم بات نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ انسان لوگوں کے درمیان کھلم کھلا اپنے اعمال کو اخلاص کے ساتھ انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

اخلاص کے آثار

چونکہ اخلاص انسان کے قلب و روح میں پیدا ہونے والا گراں بہا ترین موتی ہے، لہٰذا اس کے آثار و نتائج بھی انتہائی غیر معمولی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ انہیں احادیث میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

ایک بہت مشہور معروف حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

ما اخلص عبدالله عزوجل اربعين صباحا الا جرت ينابيع الحكمة من قلبه على لسانه

''کوئی بندہ ایسا نہیں ہے جو چالیس روز اللہ کیلئے خالص گزارے مگر یہ کہ حکمت کے چشمے اس کے دل سے اس کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں۔'' (عیون الاخبار الرضا، ۲:۶۹۔ بحار الانوار: ۶۷:۲۴۲)

ایک اور حدیث میں امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہما السلام فرماتے ہیں:

عند تحقق الاخلاص تستنير البصائر

''حصولِ اخلاص پر انسان کی بصیرت نورانی ہو جاتی ہے۔'' (غرر الحکم، ۲:۴۹۲)

آپؑ ہی سے منقول ایک اور حدیث میں ہے:

فی اخلاص النيات نجاح الامور

''کاموں کی کامیابی نیتوں کے اخلاص پر مضمر ہے۔'' (غرر الحکم، ۲:۱۴)

یہ نکتہ بالکل واضح ہے کہ نیت جس قدر پاکیزہ ہو، انسان اسی قدر کاموں کے باطن پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔ بعبارتِ دیگر، اس صورت میں امور کی پختگی اعلیٰ ترین حدوں پر ہوتی ہے۔ اسی لئے کاموں کے کامیابی سے ہمکنار ہونے کی ضمانت دی گئی ہے۔ اس کے برعکس اگر انسان کی نیت ریا سے آلودہ ہو تو وہ باطن سے زیادہ ظاہر پر توجہ دیتا ہے جس کے نتیجہ میں کاموں میں کھوکھلا پن پیدا ہوجاتا ہے اور وہ ناکامی سے دوچار ہوجاتے ہیں۔

اسی لئے ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

لو خلصت النیات لزکت الاعمال

''اگر نیتیں خالص ہوجائیں تو اعمال پاک ہوجاتے ہیں۔'' (غرر الحکم، ۲: ۶۳)

ریاکاری

ریاکاری اخلاص کا نکتہ مخالف ہے۔ آیات واحادیث میں اس کی شدید مذمت کی گئی ہے اور اسے اعمال کے باطل ہونے کا سبب اور منافقین کی نشانی اور شرک کی اقسام میں سے ایک قسم قرار دیا گیا ہے۔

ریاکاری فضائل اخلاقی کو تباہ کردیتی ہے اور رذائل اخلاقی کے بیج انسان کے قلب وجان میں بکھیر دیتی ہے۔ ریاکاری اعمال کو کھوکھلا کردیتی ہے اور انسان کو اعمال کے باطن پر توجہ دینے سے روک دیتی ہے۔ ریاکاری انسان کو گمراہ کرنے کے لیے شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔

اس مختصر اشارے کے بعد ہم قرآنی آیات کی روشنی میں ریاکاروں کے چہرے اور ان کے اعمال کے نتائج پر نظر ڈالتے ہیں۔

۱۔ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! احسان جتلا کر اور اذیت پہنچا کر اپنے صدقات کو باطل نہ کرو، اس شخص کی طرح جو لوگوں کو دکھانے کیلئے اپنے مال میں سے انفاق کرتا ہے اور اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس کے عمل کی مثال پتھر جیسی ہے جس پر مٹی (کی معمولی سی تہہ) ہے (اور اس میں بیج بکھیر دیئے گئے ہوں) اور اس پر بارش پڑے تو سب کچھ صاف ہوجائے۔ وہ اپنے اعمال کا کچھ نتیجہ حاصل

نہیں کرتے اور اللہ ان کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔'' (بقرہ: ۲۶۴)

۲۔ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾

''جو کوئی اپنے رب سے ملاقات کی امید رکھتا ہے، وہ عمل صالح انجام دے اور کسی کو اپنے رب کی عبادت میں شریک نہ کرے۔'' (کہف: ۱۱۰)

۳۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾

''منافق اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں اور وہ انہیں دھوکا دیتا ہے، جب وہ نماز کیلئے کھڑے ہوتے ہیں تو ان پر سستی چھائی ہوئی ہوتی ہے، وہ ریا کاری کرتے ہیں اور اللہ کا ذکر بہت کم کرتے ہیں۔'' (نسا: ۱۴۲)

۴۔ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۴۷﴾

''اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو خود خواہی اور خودنمائی کی خاطر اپنے گھروں سے نکلے۔ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے تھے اور جو کچھ وہ کرتے ہیں، اللہ اس پر محیط ہے۔'' (انفال: ۴۷)

۵۔ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ﴿۴﴾ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ﴿۵﴾ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ﴿۶﴾ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ﴿۷﴾

''ہلاکت ہے ان نمازیوں کے لیے جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں۔ جو ریا کرتے ہیں اور ضروریاتِ زندگی استعمال کیلئے نہیں دیتے۔'' (ماعون: ۴، ۷)

تفسیر

پہلی آیت میں احسان جتلانے والے، اذیت پہنچانے والے اور ریا کاری کرنے والے ایک ہی زمرے میں شمار کئے گئے ہیں اور ان سب کو صدقات کی بربادی کا سبب قرار دیا گیا ہے، بلکہ اس آیت کے الفاظ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ایسا شخص اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا، اس لئے کہ ایسے افراد کو ان لوگوں سے تشبیہ دی گئی ہے جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے:

كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ

آیت کے ذیل میں ایک بہت دلنشین مثال کے ذریعے ایسے افراد کی حالت کو بیان کیا گیا ہے:

''ان کے اعمال کی مثال ایک پتھر جیسی ہے جس پر مٹی کی باریک سی تہہ ہو (اور اس میں بیج بکھیر دیئے گئے ہوں)، اس پر زوردار بارش آئے (اور ساری مٹی اور بیجوں کو بہا کر لے جائے) اور صاف پتھر باقی رہ جائے۔''

فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ

یقیناً ایسے افراد کو ان کے کاموں کا کوئی نتیجہ نہیں ملتا اور اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔

لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ۝۲۶۴

اس آیت میں ایک لطیف اشارے کے ذریعے ریاکاروں کو اللہ اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے والے کا فر قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح ان کے اعمال کو کھوکھلا اور بے بنیاد قرار دیا گیا ہے، اس لئے کہ انہوں نے اپنے اعمال کی تخم ریزی ریا کی کھیتی میں کی، جس میں نشوونما کی کوئی صلاحیت موجود نہیں ہوتی۔

اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ وہ خود ایک پتھر کی مانند ہیں جس پر مٹی کی ہلکی سی تہہ موجود رہے اور وہ کسی بیج کی پرورش کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ بے شک ان کے دل پتھروں کی مانند ہیں اور ان کی روح پر کسی اچھی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ان کے اعمال بغیر جڑوں کے درخت کی مانند اور ان کی نیتیں آلودہ ہیں۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس آیت کے بعد اگلی آیت میں خالصین اور مخلصین کے اعمال کو سرسبز اور پر برکت باغوں سے تشبیہ دی گئی ہے جن میں اچھے بیج اور پودے لگائے گئے، مناسب بارش، دھوپ اور ہوا سے ان کی پرورش کی گئی اور اس میں بکثرت پھل پیدا ہوئے۔

دوسری آیت میں رسولؐ اللہ کو مخاطب کر کے حکم دیا جا رہا ہے کہ خالص توحید کو اسلام کی بنیاد اور اساس کی حیثیت سے لوگوں سے متعارف کروائیں:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ

''اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ میں تم جیسا انسان ہی ہوں، (مجھ میں اور تم میں صرف اس بات کا فرق ہے) کہ میری طرف وحی آتی ہے اور تمہارا معبود صرف ایک ہے۔'' (کہف: ۱۱۰)

اس کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ انسان کے تمام اعمال ہر لحاظ سے خالص ہونے چاہئیں۔ اس کے بعد فرمایا جا رہا ہے:

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا۝۱۱۰

''جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کی امید رکھتا ہے، وہ عمل صالح انجام دے اور کسی کو اپنے رب کی عبادت میں شریک نہ کرے۔''

اس آیت کی رو سے عبادت میں شرک کرنا بھی توحید کی بنیادوں کو تباہ کر دیتا ہے اور عقیدۂ آخرت کی بھی دھجیاں بکھیر دیتا ہے۔ بالفاظ دیگر جنت میں داخل ہونے کا اجازت نامہ عمل خالص ہے۔

اس آیت کے شانِ نزول میں آیا ہے کہ جندب بن زہیر نامی ایک شخص رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میں اپنے اعمال اللہ کیلئے انجام دیتا ہوں اور میرا مقصد اس کی رضا کا حصول ہے لیکن جب لوگوں کو میرے اچھے کاموں کا علم ہوتا ہے تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔

رسولؐ اللہ نے اس کی بات سن کر فرمایا:

ان الله طيب ولا يقبل الا الطيب ولا يقبل ما شورك فيه

''اللہ تعالیٰ طیب ہے اور اعمال طیب کو ہی قبول کرتا ہے، جس عمل میں کسی اور کو شریک ٹھہرایا جائے، اللہ اسے قبول نہیں کرتا۔'' (تفسیر قرطبی، ۶:۴۱۰۸)

اسی آیت کے شانِ نزول کے بارے میں ایک اور واقعہ بھی منقول ہے کہ ایک شخص آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میں اللہ کی راہ میں جہاد کو پسند کرتا ہوں مگر میری یہ خواہش ہے کہ لوگ بحیثیت مجاہد میرے مقام کو جانیں۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾

اس قسم کے اور بھی واقعات اس آیت کے شانِ نزول کے طور پر بیان کئے گئے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت ان اعمال کے بارے میں نازل ہوئی ہے جن میں اللہ کی خوشنودی کے علاوہ دیگر اہداف بھی پیش نظر تھے۔ اس آیت میں ریا کار کو ایسا مشرک قرار دیا گیا ہے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔

رسولؐ اللہ سے مروی ایک حدیث میں ہے:

من صلى يرائي فقد اشرك و من صام يرائي فقد اشرك و من تصدق يرائي فقد اشرك ثم قرء فمن كان يرجو القاء ربه.........

''جس نے نماز پڑھی اور ریا کیا، اس نے شرک کیا، جس نے روزہ رکھا اور ریا کیا، اس نے شرک کیا۔

پھر آپؐ نے یہ آیت پڑھی:

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾

(المیزان ۱۳:۴۰۷ بحوالہ درالمنثور)

تیسری آیت میں ریا کو منافقین کا عمل قرار دیا گیا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ منافقین اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں

جبکہ اللہ ان کو دھوکا دیتا ہے۔ جب وہ نماز کیلئے کھڑے ہوتے ہیں تو ان پر سستی چھائی ہوئی ہوتی ہے، وہ لوگوں کے سامنے دکھاوا کرتے ہیں اور اللہ کا ذکر بہت کم کرتے ہیں:

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿١٤٢﴾

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ نفاق ظاہر و باطن کے اختلاف کا نام ہے جبکہ ریاکاری بھی ظاہر و باطن کا اختلاف ہوتی ہے، اس لئے کہ عمل ظاہراً الٰہی ہوتا ہے لیکن اس کا باطن شیطانی اور ریاکارانہ ہوتا ہے اور لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کیلئے انجام دیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ریاکاری کو منافقین کا عمل کہنا بالکل سیدھی سی بات ہے۔

چوتھی آیت میں ریاکار کے اعمال کو اللہ اور آخرت پر ایمان سے محروم شیطان کے ساتھی کا عمل قرار دیا گیا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ لوگ لوگوں کو دکھانے کیلئے اپنا مال نیک کاموں میں خرچ کرتے ہیں اور اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے (اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان ان کا ساتھی اور ہم نشین ہے) اور جس کا ساتھی شیطان ہو، اس کا ساتھی بہت برا ہے:

وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ﴿٣٨﴾

اس آیت کی روشنی میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان کفار جیسا طرزِ عمل اپنانے سے منع فرما رہا ہے "جو خود پرستی اور خودنمائی کے جذبے سے جنگ کیلئے گھروں سے نکلے۔ وہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے تھے اور اللہ ان کے اعمال پر محیط ہے۔"

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿٤٧﴾

آیت کے اندرونی قرائن اور مفسرین کے بیانات کے مطابق یہ آیت قریش کے سپاہیوں کے بارے میں ہے جو جنگ بدر میں مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے کیلئے اپنے گھروں سے نکلے تھے۔ مکہ سے نکلتے وقت لہو ولعب کے آلات، گانا گانے والے اور شراب بھی ساتھ لئے ہوئے تھے۔ ان کی حالت سے خود پرستی اور خودنمائی اس قدر واضح تھی کہ اگر وہ بت پرستی کا دعویٰ کرتے تھے تو وہ ریاکارانہ تھا۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ چونکہ بدر عربوں کے تجارتی میلے کی جگہ تھی اور مشرکین سال کے دوران جب بھی وہاں جاتے تو ان کی، خاص طور پر ابوجہل کی، کوشش ہوتی کہ عیاشی کا سامان اپنے ساتھ لے جائے تاکہ وہاں اپنے جاننے والوں کے سامنے اپنی برتری کا اظہار کر سکے۔

بہر صورت قرآن شریف مسلمانوں کو ایسے کاموں سے منع فرما رہا ہے اور انہیں حکم دے رہا ہے کہ تقویٰ اور اخلاص کو اپنا کر

اپنی تمام مشکلات پر غلبہ حاصل کریں اور میدانِ بدر میں ریا کاروں اور خود پرستوں کا جو انجام ہوا، اس سے عبرت حاصل کریں۔

آخری آیت میں بھی ایک اور انداز سے ریا کاری کی مذمت کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''ہلاکت ہے ان نمازیوں کیلئے جو اپنی نماز سے غافل ہیں، جو ریا کرتے ہیں اور استعمال کی چیزیں لوگوں کو نہیں دیتے۔''

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ۝ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ۝ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ۝

قرآن مجید میں ''ویل'' کا لفظ ۲۷ مرتبہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ خطرناک اور سنگین گناہوں کے بارے میں استعمال ہوا ہے۔ ریا کاروں کیلئے اس لفظ کا استعمال ریا کاری کے گناہ کی شدت کو ظاہر کرتا ہے۔

مندرجہ بالا آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ ریا کس قدر قبیح اور گھناؤنا گناہ ہے اور انسان کی سعادت کی راہ میں سنگین خطرات کا باعث ہے۔ نیز یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ ریا کاری تہذیب نفس اور تطہیر قلب و روح کیلئے ایک اہم رکاوٹ ہے اور اس کا نقطۂ مقابل اخلاص اور پاکیزگی قلب ہے۔

ریا احادیث کی روشنی میں

احادیث میں ریا کے مسئلہ کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے اور اسے خطرناک ترین گناہ قرار دیا گیا ہے۔ ذیل میں ہم ان میں سے چند احادیث نقل کرتے ہیں:

۱۔ ایک حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

اخوف ما اخاف عليكم الريا و الشهوة الخفية

''سب سے زیادہ خوفناک چیز جس سے میں تمہارے بارے میں ڈرتا ہوں، ریا کاری اور خفیہ شہوت ہے۔'' (محجۃ البیضاء، ۶:۱۴۱)

ظاہراً خفیہ شہوت سے مراد ریا کاری کے مخفی محرکات ہیں۔

۲۔ ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ سے منقول ہے:

ادنى الرياء شرك

یعنی ''ریا کا ادنیٰ ترین درجہ بھی شرک ہے۔'' (محجۃ البیضاء، ۶:۱۴۱)

۳۔ ایک اور حدیث میں آپؐ ہی سے مروی ہے:

لا یقبل اللہ عملا فیہ مقدار ذرۃ من ریاء

''جس عمل میں ذرہ بھر ریا ہو، اللہ اسے قبول نہیں کرتا۔'' (محجۃ البیضاء، ۶:۱۴۱)

۴۔ آنحضرتؐ سے مروی ایک اور حدیث میں ہے:

ان المرائی ینادی علیہ یوم القیامۃ فاجر یا غادر یامرائی ضل عملک و حبط اجرک اذھب فخذ اجرک ممن کنت تعمل لہ (محجۃ البیضاء، ۶:۱۴۱)

''قیامت کے دن ریاکار کو آواز دی جائے گی: اے فاجر! اے فریب کار! اے ریاکار! تیرے اعمال کھو گئے۔ تیرا اجر برباد ہو گیا۔ جا! اپنے اعمال کا اجر انہیں سے لے جن کیلئے تو نے عمل کیا تھا۔''

۵۔ ایک صحابی کہتے ہیں کہ میں نے رسولؐ اللہ کو روتے ہوئے دیکھا، عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! آپ کیوں گریہ کر رہے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا:

انی تخوفت علی امتی الشرك، اما انھم لایعبدون صنما ولا شمسا ولاقمر او لاحجرا، ولکنھم یرائون باعمالھم

''میں اپنی امت کے بارے میں شرک سے خائف ہوں۔ وہ کسی بت، سورج، چاند یا پتھر کو نہیں پوجیں گے لیکن اپنے اعمال میں ریاکاری کریں گے۔'' (محجۃ البیضاء، ۶:۱۴۱)

۶۔ ایک اور حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں: (محجۃ البیضاء، ۶:۱۴۱)

ان الملك لیصعد بعمل العبد مبتھجا بہ فاذا صعد بحسناتہ یقول اللہ عزوجل اجعلوھا فی سجین انہ لیس ایای ارادبھا

''فرشتہ کسی شخص کے عمل کو خوشی کے ساتھ اوپر لے جاتا ہے، جب وہ اس کی نیکیاں لے کر اوپر پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ انہیں جہنم میں ڈال دو، اس نے یہ اعمال میرے لئے انجام نہیں دیئے۔''

۷۔ ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ فرماتے ہیں:

یقول اللہ سبحانہ انی اغنی الشرکاء فمن عمل عملا ثم اشرك فیہ غیری فانا منہ بریء و ھو للذی اشرك بہ دونی

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں شرکاء سے بے نیاز ہوں۔ جو کوئی کسی عمل کو انجام دے اور میرے سوا کسی اور کو اس میں شریک کرے، میں اس عمل سے بیزار ہوں اور یہ عمل اس کیلئے ہے جسے شرک قرار دیا گیا''

ہے۔" (میزان الحکمہ، ۲:۱۰۱۷)

رسولؐ اللہ سے مروی یہ سات احادیث، جو انتہائی بامعنی اور جھنجھوڑ دینے والی ہیں، اس حقیقت کو بخوبی واضح کرتی ہیں کہ شرک اتنا بڑا گناہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے آثار ونتائج، جو فرد، معاشرے، جسم اور روح پر مرتب ہوتے ہیں، بہت ہی برے ہیں۔

آئمہ معصومین سے بھی اس سلسلہ میں ہلا دینے والی روایات موجود ہیں:

۸۔ ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

سياتي على الناس زمان تخبث فيه سرائرهم وتحسن فيه علانيتهم خوف يعمهم الله بعقاب فيدعونه دعاء الغريق فلا يستجيب لهم

"لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا جب ان کا ظاہر حسین اور باطن آلودہ ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہوگی کہ وہ دنیا کی طمع میں گرفتار ہو جائیں گے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، اس کی خواہش نہیں کریں گے۔ ان کا دین ریا کاری ہوگا، ان کے دلوں میں خوفِ خدا نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنا عذاب پھیلا دے گا، پھر وہ اسے اس طرح پکاریں گے جیسے ڈوبنے والا پکارتا ہے لیکن ان کی دعا قبول نہ ہوگی۔" (اصولِ کافی، ۲:۲۹۵)

۹۔ ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

كل رياء شرك انه من عمل للناس كان ثوابه على الناس ومن عمل لله كان ثوابه على الله

"ہر ریا شرک ہے۔ جو شخص لوگوں کیلئے عمل کرتا ہے، اس کا اجر بھی لوگوں کے ذمہ ہے۔ جو شخص اللہ کیلئے عمل کرتا ہے، اس کا اجر بھی اللہ کے ذمہ ہے۔" (اصولِ کافی ۲:۲۹۳)

۱۰۔ ایک حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

المرائي ظاهره جميل وباطنه عليل........

"ریا کار کا ظاہر خوبصورت اور باطن بیمار ہوتا ہے۔" (امالی صدوق: ۳۹۸، غرر الحکم: ۱:۶۰)

اس سلسلہ میں رسولؐ اللہ اور آئمہ معصومینؑ سے بکثرت احادیث پائی جاتی ہیں۔

ریا کی حرمت کا فلسفہ

شاید ظاہر بین افراد ریا اور اس کے وحشت ناک آثار کے بارے میں یہ احادیث دیکھ کر حیرت زدہ ہو جائیں اور یہ سوچنے لگیں کہ اگر انسان کا عمل اچھا ہو تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اس کی نیت کیا ہو! فرض کریں ایک انسان ہسپتال یا مسجد، سڑک، پل یا کوئی ایسی چیز بنوائے جس سے عوام الناس کو فائدہ ہو تو اس کی نیت جیسی بھی ہو، لوگوں کو اس کے عمل کا فائدہ تو پہنچ رہا ہوتا ہے۔

یہ طرز فکر ایک بہت بڑی غلطی ہے، اس لئے کہ ہر عمل اپنے اندر دو قسم کے اثرات رکھتا ہے: ایک اثر خود اس کے کام کے انجام دینے والے پر اور دوسرا لوگوں پر۔ ریا کار اپنے ریا کارانہ عمل کے ذریعے اپنے باطن کو ویران کر دیتا ہے اور توحید کے عظیم الشان مقام سے دور ہو کر شرک کی گھاٹیوں میں جا گرتا ہے۔ وہ لوگوں کو عزت کا سبب سمجھنے لگتا ہے اور اللہ کو بھول جاتا ہے۔ یہ ریا کاری ایک قسم کی بت پرستی ہے جو بہت سی اخلاقی برائیوں کا سرچشمہ ہے۔

اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ ریا کاری کی بنیاد پر انجام پانے والا عمل معاشرے کیلئے بھی نقصان کا سبب ہو سکتا ہے، اس لئے کہ اس صورت میں ریا کار شخص، عمل کے باطن اور حقیقت کی بجائے اس کے ظاہر پر توجہ دیتا ہے، جس کا نتیجہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی بہبود کیلئے کیا جانے والا کام لوگوں کیلئے عذاب بن جاتا ہے اور اس سے نا قابل تلافی نقصانات بھی رونما ہوتے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں جو معاشرہ ریا کاری کا عادی ہو جاتا ہے، وہ اندر سے کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ اس معاشرے کی سیاست، معیشت، ثقافت، دفاع، غرضیکہ ہر چیز کھوکھلی ہو جاتی ہے۔ ہر جگہ ظاہر پر قناعت ہو رہی ہوتی ہے اور کوئی بھی معاشرے کی خیر و سعادت کا خواہش مند نہیں ہوتا۔ ہر شخص انہی کاموں کے پیچھے پڑا رہتا ہے جس کا ظاہر خوبصورت ہوتا ہے۔ اس طرز فکر و عمل سے معاشرے کی ساخت پر جو زد پڑتی ہے، وہ کسی عقلمند پر پوشیدہ نہیں ہے۔

ریا کاروں کی علامات

مندرجہ بالا احادیث اور ان جیسے دیگر سخت بیانات پڑھ کر بہت سے لوگ ریا اور ریا کار کی شناخت کے بارے میں وسوسوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ البتہ یہ بات بالکل بجا ہے کہ انسان ریا کے بارے میں سخت گیری کرے، اس لئے کہ ریا انتہائی پر اسرار طور پر انسان کے اندر داخل ہوتا ہے۔ ممکن ہے انسان سالہا سال تک ایک عمل کو انجام دیتا رہے اور کئی سالوں کے بعد اسے معلوم ہو کہ اس کے عمل کی ساری عمارت ریا کی بنیاد پر کھڑی ہے۔

لیکن اس کے باوجود انسان کو اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے اور افراط و تفریط سے بچنا چاہئے۔ ریا کو اس کی علامات کی روشنی میں سمجھنا اور پہچاننا چاہئے اور خواہ مخواہ کے وسوسوں سے بچنا چاہئے۔

علمائے اخلاق نے اس سلسلہ میں بہت اچھی مباحث کی ہیں۔ مرحوم فیض کاشانی نے محجۃ البیضاء میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ اگر

کوئی عالم یا واعظ یہ جاننا چاہے کہ وہ اپنے مواعظ میں مخلص ہے، ریا کار نہیں ہے تو کیا کرے؟

پھر وہ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں:

اس بات کی کئی علامات ہیں۔ ایک یہ کہ اگر اس سے بہتر واعظ، جس کی مقبولیت اور علم بھی زیادہ ہو، معاشرے میں پیدا ہو جائے تو وہ خوش ہو اور حسد کے جذبات اس کے دل میں پیدا نہ ہوں، ہاں! رشک اور چیز ہے کہ وہ اس جیسا یا اس سے بہتر بننے کی آرزو کرے۔

دوسری علامت یہ ہے کہ اگر معاشرے کی بڑی اور معتبر شخصیات اس کی مجلس میں ہوں تو اس کے بولنے کے انداز میں کوئی تبدیلی نہ آئے۔ ان کی توجہ حاصل کرنے کیلئے اس کا انداز نہ بدلے بلکہ سب حاضرین کو ایک نظر سے دیکھے۔

ایک اور نشانی یہ ہے کہ اگر گلی یا بازار میں چلتے وقت اس کے سامعین یا ارادتمندوں کی ایک جماعت اس کے پیچھے پیچھے چل رہی ہو تو اس سے اسے خوشی نہ ہو۔ (محجۃ البیضاء، ۶: ۲۰۰)

ریا کارانہ اور غیر ریا کارانہ اعمال کا فرق جاننے کیلئے بہترین کسوٹی وہی ہے جو احادیث میں بیان ہوئی ہے:

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں ہے:

اما علامة المرائی فاربعة: یحرص فی العمل لله اذا کان عنده احد ویکسل اذا کان وحده ویحرص فی کل امره علی المحمدة ویحسن سمته بجهده

''ریا کار کی چار علامات ہیں اگر کوئی اس کے پاس موجود ہو تو عمل کی خواہش اس میں پیدا ہوتی ہے، جب تنہا ہوتا ہے تو عمل میں سستی کرتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کے ہر کام پر اس کی تعریف کریں اور ہر لحاظ سے اپنے ظاہر کو بہتر بنانے میں لگا رہتا ہے۔'' (تحف العقول: ۱۷)

۲۔ ایک اور حدیث میں یہی بات امیر المومنین علیہ السلام نے ذرا مختلف انداز میں بیان کی ہے:

للمرائی اربع علامات:

یکسل اذا کان وحده وینشط اذا کان فی الناس و یزید فی العمل اذا اثنی علیه وینقص منه اذا لم یثنی علیه (شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ۲: ۱۰۸)

''ریا کار کی چار علامات ہیں:

اکیلا ہو تو سستی کے ساتھ عمل کرتا ہے، لوگوں کے درمیان ہو تو نشاط و تازگی کے ساتھ عمل کرتا ہے، اس کی تعریف کی جائے تو اس کے عمل میں اضافہ ہو جاتا ہے اور تعریف نہ کی جائے تو اس کا عمل کم ہو جاتا ہے۔''

مختصر یہ کہ ہر وہ کام جو لوگوں کی نظر میں زیادہ خوبصورت اور پر کشش بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی جائے، اس میں ریا کاری کا جذبہ داخل ہو جانے کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ یہ محرک خواہ کتنا ہی پوشیدہ اور مخفی کیوں نہ ہو، خلوت وجلوت میں عمل کی انجام دہی کی کیفیت کے مختلف ہونے کی مدد سے آشکار ہو جاتا ہے۔

یہ بات اس قدر مرموز اور پراسرار ہے کہ بعض اوقات انسان اپنے ضمیر کو فریب دینے کیلئے خلوت میں اپنے عمل کو بہتر بنانے میں مصروف ہو جاتا ہے تاکہ اسے جلوت میں پر کشش بنانے کا جواز حاصل کر سکے۔ اس صورت میں جلوت میں انجام دیئے جانے والے عمل کے ساتھ خلوت میں انجام دیا جانے والا عمل بھی ریا سے آلودہ ہو جاتا ہے۔

لیکن جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اس سلسلہ میں افراط وتفریط سے بچنا ضروری ہے۔ اکثر اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ بہت سے لوگ ریاکاری سے بچنے کیلئے نمازِ با جماعت اور منبر سے درس یا وعظ کہنا ترک کر دیتے ہیں۔

احادیث میں بھی یہ بات بیان کی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی عمل انجام دے اور لوگوں کو اس کا علم ہونے پر وہ شخص خوش ہو تو اس کے عمل کی صحت اور قربت الٰہی پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اگر اس نے ابتداء میں اس کام کو اللہ کیلئے انجام دیا ہو۔ (وسائل الشیعہ ۱:۵۵)

یہاں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نیک لوگوں کی حوصلہ افزائی کیلئے کسی محفل میں یا ذرائع ابلاغ کے ذریعے کسی کی نیکی کی تشہیر کرنا ممنوع نہیں ہے بلکہ بزرگوں کی سیرت یہ رہی ہے کہ وہ ایسا کرتے رہے ہیں۔ اس طرح سے عمل کو انجام دینے والے کا اجر بھی ضائع نہیں ہوتا، بشرطیکہ ابتداء میں اس کی نیت خالص ہو۔

قرآنی آیات میں متعدد مقامات پر پوشیدہ اور دکھا کر صدقہ دینے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بالکل ممکن ہے کہ انسان لوگوں کو دکھا کر عمل کرے اور اس کا عمل ریا سے محفوظ بھی ہو۔

قرآن مجید کی پانچ آیات میں انفاق کو "**سرا و علانية**" یا "**سرا وجهرا**" انجام دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ ان دونوں کے معنی ہیں "پوشیدہ وآشکار" (بقرہ: ۲۷۴، رعد: ۲۲، ابراہیم: ۳۱، نحل: ۷۵، فاطر: ۲۹)

بنیادی طور پر بعض اسلامی عبادات کو لوگوں کی موجودگی میں ہی انجام دیا جا سکتا ہے جیسے نماز جمعہ، حج، نمازِ جنازہ اور جہاد وغیرہ۔ اگر انسان وسوسوں کا شکار ہو جائے تو وہ ان سب کو ترک کر دیتا ہے۔

ریا کا علاج

تمام ناپسندیدہ اعمال واخلاق کے علاج کی طرح ریا کا علاج بھی دو طرح سے کیا جا سکتا ہے:

ایک یہ کہ اس کے اسباب وعوامل کی طرف توجہ کر کے ان کا خاتمہ کیا جائے اور دوسرے یہ کہ اس کے خطرناک منفی نتائج پر غور کیا جائے جو اس برائی سے آلودہ افراد کو پیش آ سکتے ہیں۔

ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ ریا کا بنیادی وجہ "شرکِ افعالی" اور "حقیقت توحید سے غفلت" ہے۔ اگر ہمارے اندر توحید افعالی

کی بنیادیں مضبوط ہوں اور ہمیں اس بات کا یقین ہو کہ عزت، ذلت، رزق اور نعمتیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں، یہاں تک کہ لوگوں کے دل بھی اس کے اختیار میں ہیں تو ہم کسی طور پر بھی این و آن کی پسند کی خاطر اپنے اعمال کو ریا سے آلودہ نہیں کریں گے۔

اگر ہمیں یقین ہو کہ جو اللہ کے ساتھ ہے، اس کے پاس سب کچھ ہوتا ہے اور جو اللہ سے دور ہوتا ہے، اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا:

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۭ

''اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور اگر اللہ تم کو چھوڑ دے تو کوئی تمہاری مدد نہیں کرسکتا۔'' (آل عمران:۱۶۰)

اسی طرح ہمیں یہ حقیقت بھی مدنظر رکھنی چاہئے:

اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَھُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ١٣٩

''اللہ کے دشمنوں سے دوستی کرنے والے ان کے پاس عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ ہر قسم کی عزت تو صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔'' (نساء:۱۳۹)

اگر ان چیزوں پر ایمان ہمارے دل و جان کی گہرائی میں اتر جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ انسان لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کیلئے کوئی عمل انجام دے یا ان کی نظر میں عزت اور اعتماد حاصل کرنے کیلئے اپنے اعمال کو ریا سے آلودہ کر لے۔

بعض علمائے اخلاق کا کہنا ہے کہ ریا کی بنیادی وجہ حب جاہ و مقام ہے۔ اگر اس بات کو کھولا جائے تو تین چیزیں سامنے آتی ہیں: لوگوں کی طرف سے تعریف کی خواہش، لوگوں کی طرف سے مذمت سے فرار اور جو کچھ لوگوں کے پاس ہے، اس کی طمع۔

اس کے بعد وہ ایسے شخص کی مثال بیان کرتے ہیں جو اس لئے جہاد پر جاتا ہے کہ لوگ اس کی بہادری کی باتیں کریں یا اس لئے جہاد کرتا ہے کہ لوگ اسے بزدل نہ کہیں، یا اس لئے جہاد کرتا ہے تا کہ مال غنیمت حاصل کر سکے۔ صرف وہی شخص اپنے جہاد کا صحیح ثمر حاصل کرسکتا ہے جو اللہ کے دین کی حفاظت اور سربلندی کیلئے دشمنانِ دین سے جنگ کرے۔

دوسری طرف سے اگر انسان ریا کاری کے خطرناک نتائج پر غور کرے کہ ریا ایک ایسی آگ ہے جو انسان کے اعمال کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے، صرف اس کی عبادت کو تباہ و برباد نہیں کرتی بلکہ ایسا گناہ بھی ہے جو دنیا اور آخرت میں انسان کو رسوا کر دیتا ہے۔ ریا ایک دیمک ہے جو انسان کی سعادت کے محل کی نبیادوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ ریا ایک قسم کا کفر و نفاق اور شرک ہے۔ ریا کاری انسان کی شخصیت کو تباہ کر دیتی ہے اور اسے حقیقی آزادی اور احترام سے محروم کر دیتی ہے۔ قیامت کے دن اسے بدبخت ترین انسان بنا دیتی ہے۔

اگر ان باتوں کی طرف توجہ کی جائے تو ان کا مثبت اثر ضرور ظاہر ہوگا اور ریا کار ریا سے رک جائے گا۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ریا سے آلودہ نیتوں کو زیادہ عرصہ تک چھپا کر رکھنا ممکن نہیں ہے۔ ریا کاروں کی قلعی عام طور پر اسی دنیا میں کھل جاتی ہے اور وہ ذلیل ورسوا ہوجاتے ہیں۔ان کی باتوں سے ریا کی آلودگی ظاہر ہوتی رہتی ہے جس سے لوگوں کی نظروں سے ان کی عزت جاتی رہتی ہے۔اس نکتہ کی طرف توجہ رکھنے سے بھی انسان ریا سے رک سکتا ہے۔

خالص عمل سے انسان کو جو روحانی اور معنوی لذت حاصل ہوتی ہے، اس کا موازنہ کسی چیز سے نہیں کیا جا سکتا۔یہی بات نیت کو خالص بنانے کیلئے کافی ہے۔

بعض علمائے اخلاق نے کہا ہے کہ ریا کے علاج کا ایک طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی عبادات اور نیکیوں کو پوشیدہ رکھنے کا اہتمام کرے تاکہ آہستہ آہستہ یہ بات ایک پختہ عادت بن جائے۔لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ جمعہ، جماعت، حج اور دیگر اجتماعی عبادات میں شرکت سے گریز کرنے لگے کیونکہ یہ بھی ایک بہت بڑا نقصان ہے۔

کیا عبادت میں نشاط خلافِ اخلاص ہے؟

بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان کسی عبادت کو اچھی طرح سے انجام دینے کے بعد سرور اور نشاط محسوس کرے تو کیا یہ ریا کاری کی علامت نہیں ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر اس سرور ونشاط کا سبب اللہ کی دی ہوئی توفیق عمل اور عمل سے حاصل ہونے والی نورانیت اور روحانیت ہو تو یہ اخلاصِ نیت کے منافی نہیں ہے۔لیکن اگر اس نشاط کی وجہ یہ ہو کہ لوگوں نے اسے یہ عمل کرتے ہوئے دیکھا ہے تو یہ خلوص کے منافی ہے۔اگرچہ اس سے عمل باطل نہیں ہوتا، بشرطیکہ لوگوں کے مشاہدہ کی وجہ سے وہ اپنے عمل کی مقدار اور معیار میں تبدیلی نہ لائے۔

احادیث میں بھی یہ بات بیان ہوئی ہے۔ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ان کے ایک صحابی نے سوال کیا کہ اگر ایک شخص کوئی عمل انجام دے رہا ہو اور کوئی دوسرا اسے دیکھ رہا ہو جس سے عمل کرنے والے کو خوشی ہو تو کیا یہ خلوص نیت کے خلاف ہے؟

آپؑ نے فرمایا:

لا بأس، ما من احد الا وهو يحب ان يظهر له في الناس الخير اذا لم يكن صنع ذلك لذلك!

''کوئی حرج نہیں ہے، ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا عمل خیر لوگوں میں معروف ہو (اور لوگ اسے ایک نیک آدمی کے طور پر پہچانیں) بشرطیکہ عمل کو انجام دینے کا مقصد یہ نہ ہو۔''

(وسائل الشیعہ، ۱:۵۵)

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے اس سے ملتا جلتا سوال رسولؐ اللہ سے کیا کہ اگر کوئی انسان کوئی عمل

قربِ الٰہی کے حصول کی نیت سے انجام دے اور لوگ اس کے اس عمل کی وجہ سے اسے اچھا سمجھنے لگیں تو یہ کیسا ہے؟

آپؑ نے فرمایا:

تلك عاجل بشری المومن

''یہ ایک بشارت ہے جو اللہ اس دنیا میں مومن کو دیتا ہے۔''

ریا اور سمعہ کا فرق

یہاں ایک اور سوال رونما ہوتا ہے کہ ریا اور سمعہ میں کیا فرق ہے؟ آیا یہ دونوں خلوص نیت کے خلاف اور بطلانِ عمل کا موجب ہوتے ہیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ریا یہ ہے کہ انسان کسی عمل کو اس طرح انجام دے کہ لوگ اسے دیکھیں اور اس طرح لوگوں کی نظر میں اس کا مقام و مرتبہ اونچا ہو جائے۔ لیکن سمعہ یہ ہے کہ انسان اپنا عمل تو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ انجام دے تاکہ بعد میں اسے لوگوں کو سنا سکے اور معاشرے میں اس کا مقام و مرتبہ اونچا ہو جائے۔ ان دونوں اعمال کا محرک غیر الٰہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ریا میں عمل لوگوں کو دکھایا جاتا ہے اور سمعہ میں عمل لوگوں کو سنایا جاتا ہے۔ ان دونوں حالتوں میں عمل باطل ہوتا ہے۔

لیکن اگر سمعہ کی تشریح اس طرح کی جائے کہ انسان کسی عمل کو قصد قربت الٰہی کی نیت سے انجام دیتا ہے، بعد میں جب لوگ اس کے اس عمل کے بارے میں سنتے ہیں تو اسے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اس حالت میں یقیناً عمل باطل نہیں ہوتا۔

اگر کوئی شخص کسی عمل کو مقصد قربت سے انجام دے اور بعد میں یہ سوچنے لگے کہ اپنے عمل کا چرچا کر کے شہرت اور عزت حاصل کرے (اس عمل کو ریا بعد از عمل کہتے ہیں)، تو اس سے عمل تو باطل نہیں ہوتا لیکن اس کی قدر و قیمت ضرور کم ہو جاتی ہے اور یہ اخلاقی انحطاط کا سبب بھی بنتا ہے۔

بعض فقہائے بزرگ نے انسان کے عمل میں ریا کاری کے داخل ہونے کی دس صورتیں بیان کی ہیں:

۱۔ اس کے عمل کا مقصد اور نیت ہی یہ ہو کہ عمل لوگوں کو دکھانے کیلئے کیا جائے۔ ایسی صورت میں عمل یقیناً باطل ہوگا۔

۲۔ اس کے عمل کا مقصد قربِ الٰہی بھی ہو اور ریا کاری بھی۔ اس صورت میں بھی عمل باطل ہے۔

۳۔ اعمال کے بعض اجزا کو مثلاً نماز میں رکوع یا سجدے کو ریا کاری کیلئے انجام دے۔ اس صورت میں بھی عمل باطل ہے، اگرچہ اس جزو کے تدارک کی فرصت ابھی باقی ہو۔ اسی لئے بعض فقہاء نے نماز کے دوران ریا کو نماز کے دوران وضو ٹوٹ جانے سے تشبیہ دی ہے۔ اگرچہ اس میں احتیاط یہ ہے کہ ریا زدہ جزو کو دوبارہ انجام دیا جائے اور بعد میں نماز کو دوبارہ پڑھا جائے۔

۴۔ کسی مستحب جزو مثلاً دعائے قنوت وغیرہ میں ریا کرنا۔ اس کو بھی بطلانِ عمل قرار دیا گیا ہے۔

۵۔ عمل اللہ کیلئے انجام دیا گیا ہو لیکن ایسی جگہ یا مسجد وغیرہ میں انجام دیا گیا ہو جس کا محرک الٰہی نہ ہو۔اس صورت میں بھی عمل باطل ہے۔

۶۔ عمل اللہ کیلئے ہو لیکن ایسے وقت میں انجام دیا جائے جس کا محرک الٰہی نہ ہو، مثلاً کوئی شخص اول وقت میں نماز ادا کرتا ہے، نماز تو اللہ کیلئے ادا کرتا ہے لیکن اول وقت کے معاملہ میں ریا کرتا ہے۔اس صورت میں بھی عمل باطل ہے۔

۷۔ عمل کی بعض خصوصیات میں ریا کاری کرنا مثلاً کوئی شخص نماز تو اللہ ہی کیلئے ادا کرتا ہے لیکن اس کے خشوع اور خضوع کی کیفیت میں ریا کاری کرتا ہے۔اس صورت میں بھی عمل باطل ہے کیونکہ یہ صفات عمل سے جدا نہیں ہیں۔

۸۔ عمل اللہ کیلئے انجام دیا جائے لیکن اس کے بعض مقدمات میں ریا کاری کی جائے۔مثال کے طور پر کوئی شخص مسجد میں اللہ کی خوشنودی کیلئے نماز ادا کرتا ہے لیکن اس کے مسجد کی طرف جانے میں ریا کاری پائی جاتی ہے۔اکثر فقہاء اس ریا کو عمل کے باطل ہونے کا سبب نہیں سمجھتے اور فقہی قاعدے کا بھی یہی تقاضا ہے۔

۹۔ عمل کی بجائے عمل کے بعض بیرونی اوصاف میں ریا کرنا، مثلاً یہ کہ انسان نماز اللہ کیلئے ادا کرے لیکن عمامہ باندھنے وغیرہ میں ریا کاری کرے۔یہ عمل اگرچہ مذموم ہے لیکن اس سے اصل عمل باطل نہیں ہوتا۔

۱۰۔ عمل اصل میں اللہ کیلئے انجام دیا جائے لیکن اگر لوگ دیکھ رہے ہوں تو اس سے عمل انجام دینے والے کو خوشی ہو مگر اس سے عمل کی کیفیت اور کمیت پر کوئی فرق نہ پڑے، اس سے بھی عمل باطل نہیں ہوتا بلکہ حقیقت میں یہ ریا ہی نہیں ہے، اس لئے کہ ریا کی حقیقت یہ ہے کہ عمل کو انجام دینے کا بنیادی مقصد ہی لوگوں کو دکھانا ہو۔

ریا کے بارے میں اس بحث کو ہم یہاں پر ختم کرتے ہیں۔اگرچہ اس بارے میں اور بھی مباحث ہیں لیکن طوالت سے پرہیز کی خاطر ہم انہیں نظر انداز کرتے ہیں۔

خاموشی اور اصلاحِ زبان

بہت سی احادیث میں ان دو چیزوں کے بارے میں بحث کی گئی ہے اور انہیں غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے۔علمائے اخلاق کی نظر میں بھی ان دونوں کو بہت اہمیت دی گئی ہے بلکہ یہاں تک بھی کہا گیا ہے کہ سالکانِ راہِ حق خاموشی کے بغیر اور زبان کے گناہوں سے اجتناب کے بغیر کوئی پیش رفت نہیں کر سکتے، خواہ مختلف اقسام کی دوسری جسمانی اور روحانی عبادتیں اور ریاضتیں کرتے ہیں۔

بالفاظِ دیگر تہذیبِ نفس اور سیر الی اللہ کی وادی میں داخل ہونے کی کنجی خاموشی اور اصلاحِ زبان ہیں۔جو لوگ اس مرحلہ میں ناکام ہو جائیں، وہ اعلیٰ روحانی منازل سے محروم رہ جاتے ہیں۔

اس تعارفی اشارے کے بعد ہم قرآن مجید کی آیات کی روشنی میں اس موضوع کا جائزہ لیتے ہیں۔

جب حضرت مریمؑ دردِ زہ کی تکلیف دہ کیفیت سے گزر رہی تھیں اور وہ آبادی سے دور ایک خشک بیابان میں تھیں، اس کے

علاوہ بچے کی پیدائش کے بعد لوگوں کی طرف سے لگائی جانے والی تہمتوں کا خوف ان پر چھایا ہوا تھا، ان کی اس کیفیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اس حالت میں موت کی آرزو کر رہی تھیں۔اس حالت میں اچانک انہوں نے یہ آواز سنی:

''غمگین نہ ہو، ہم نے تمہارے پاؤں کے نیچے چشمہ جاری کر دیا ہے اور اللہ کے حکم سے کھجور کا خشک درخت پھلدار ہو گیا ہے۔اس پھل میں سے کھاؤ اور پانی میں سے پیو اور اپنی آنکھیں اس نومولود بچے سے ٹھنڈی کرو۔جب بھی تم کسی انسان کو دیکھو جو اس بارے میں تم سے وضاحت طلب کرے تو اشارے سے کہہ دو کہ میں نے رحمن کیلئے روزہ رکھا ہوا ہے اور آج میں کسی انسان سے کوئی بات نہیں کروں گی۔'' (مریم: ۲۳ تا ۲۶)

فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَ كُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿۲۳﴾ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَاۤ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۴﴾ وَهُزِّيْۤ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿۲۵﴾ فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْۤ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ﴿۲۶﴾

اس آیت میں اگرچہ کئی چیزیں غور طلب ہیں لیکن جو بات ہمارے پیش نظر ہے، وہ یہ ہے کہ اس آیت میں حضرت مریمؑ کو خاموشی کا روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ظاہر سی بات ہے کہ منت کسی ایسی چیز کی ہی مانی جا سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی نظر میں پسندیدہ ہو۔بنابرایں اس آیت میں خاموشی کا روزہ اللہ کا پسندیدہ عمل تھا۔آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں خاموشی کا روزہ لوگوں کے درمیان ایک جانا پہچانا عمل تھا۔لہٰذا جب انہوں نے اشارے سے بتایا کہ انہوں نے خاموشی کا روزہ رکھا ہوا ہے تو کسی نے ان پر اعتراض نہیں کیا۔

اسلام میں زمان و مکان کی شرائط مختلف ہونے کی وجہ سے خاموشی کا روزہ حرام ہے۔حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے مروی ایک حدیث میں ہے:

وصوم الصمت حرام

یعنی ''خاموشی کا روزہ حرام ہے۔'' (وسائل الشیعہ، ۷:۳۹۰)

یہی بات امیر المومنین علیہ السلام کی نصیحتوں میں بھی بیان ہوئی ہے۔ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ولا صمت یوما الی اللیل

یعنی ''اسلام میں صبح سے رات تک خاموشی کا روزہ نہیں ہے۔'' (وسائل الشیعہ، ۷:۳۹۰)

البتہ اسلام میں مکمل روزے کے آداب میں سے ایک یہ ہے کہ انسان روزہ کی حالت میں اپنی زبان کو ان باتوں سے

آلودہ نہ کرے جنہیں گناہ قرار دیا گیا ہے۔اسی طرح ضروری ہے کہ روزے کے دوران انسان اپنی آنکھوں اور کانوں کو گناہ سے آلودہ نہ ہونے دے۔ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان الصوم لیس من الطعام والشراب وحدہ ان مریم قالت انی نذرت للرحمان صوما ای صمتا فاحفظوا السنتکم وغضوا ابصارکم

''روزہ صرف کھانے پینے سے اجتناب کا نام نہیں ہے۔حضرت مریمؑ نے لوگوں سے کہا تھا کہ میں نے اللہ کیلئے (خاموشی) کا روزہ رکھا ہوا ہے۔لہٰذا جب تم روزے سے ہوتے ہوتو اپنی زبان اور آنکھوں کو گناہ سے محفوظ رکھو۔''(نورالثقلین، ۳:۲:۳۳۲)

بہرحال اس آیت اور اس کی تفسیر میں بیان ہونے والی روایت سے خاموشی کی اہمیت بخوبی واضح ہوجاتی ہے۔اس سورۃ کی آیت ۱۰ میں بھی خاموشی کی اہمیت کی طرف اشارہ ملتا ہے۔جب حضرت ذکریاؑ کو بڑھاپے میں اور بیوی کے بانجھ ہوجانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بیٹے (حضرت یحییٰ) کی ولادت کی بشارت دی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اس کی نشانی طلب کی۔انہیں جواب ملا کہ نشانی یہ ہے کہ تمہاری زبان صحیح وسالم ہونے کے باوجود تین دن تک تم لوگوں سے بات نہ کرسکو گے (اور تمہاری زبان صرف دعا اور ذکر خدا کر سکے گی)۔

اس آیت میں اگر چہ خاموشی کی تعریف یا مذمت نہیں کی گئی ہے لیکن اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ذکریاؑ کیلئے نشانی قرار دیا جانا ہی یہ ثابت کرنے کیلئے کافی ہے کہ خاموشی ایک الٰہی عمل ہے۔یہی بات سورۂ آلِ عمران کی آیت ۴۱ میں بھی بیان کی گئی ہے۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ حضرت ذکریا علیہ السلام کا لوگوں سے گفتگو نہ کرنا اختیاری عمل تھا۔ایسا نہیں تھا کہ ان کی زبان دعا اور ذکر خدا کے علاوہ کوئی بات کرنے کی قدرت ہی نہ رکھتی تھی۔بالفاظ دیگر حضرت ذکریاؑ کو تین دن کیلئے خاموشی کا روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا تھا۔

فخر رازی نے یہ تفسیر ابومسلم سے نقل کی ہے اور اسے عمدہ اور معقول تفسیر قرار دیا ہے۔لیکن یہ تفسیر آیت کے الفاظ کے ساتھ سازگار نہیں ہے،اس لئے کہ حضرت ذکریاؑ نے اللہ تعالیٰ سے اس بشارت کی نشانی طلب کی تھی۔ظاہر سی بات ہے کہ اختیاری سکوت کو ایسی نشانی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

بہرحال آیت کی تفسیر میں یہ اختلافات ہمارے اس مقصد سے کوئی اختلاف نہیں رکھتے کہ از روئے قرآن خاموشی ایک پسندیدہ عمل ہے،اس لئے کہ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ خاموشی ایک قابل قدر عمل تھا جسے ایک الٰہی نشانی قرار دیا گیا۔

خاموشی، احادیث کی روشنی میں

احادیث میں ''صمت'' یعنی خاموشی کی اہمیت پر بہت زیادہ روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے بارے میں نہایت لطیف و ظریف نکات بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے نتائج و اثرات کو انتہائی دلکش اور دلنشین انداز میں واضح کیا گیا ہے۔

۱۔ رسول اللہ سے مروی ایک حدیث میں ہے: (بحارالانوار، ۷۵:۳۱۲)

اذار ایتم المومن صموتا فادنوا منه فانه یلقی الحکمة و المومن قلیل الکلام کثیر العمل و المنافق کثیر الکلام قلیل العمل

''جب تم کسی مومن کو دیکھو کہ وہ زیادہ تر خاموش رہتا ہے تو اس کے قریب ہو جاؤ، اس لئے کہ وہ تمہیں علم و حکمت دے گا۔ مومن باتیں کم اور عمل زیادہ کرتا ہے جبکہ منافق باتیں زیادہ اور عمل کم کرتا ہے۔''

۲۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

دلیل العاقل التفکر و دلیل التفکر الصمت

''عاقل کی علامت غور و فکر ہے اور غور و فکر کی علامت خاموشی ہے۔'' (بحارالانوار، ۷۵:۳۱۲)

۳۔ امیر المؤمنین علیہ السلام کا ارشاد ہے:

اکثر صمتك یتو فر فکرك و یستنر قلبك ویسلم الناس من یدك

''اپنی خاموشی کو زیادہ کرو، تمہاری فکر ترقی کرے گی اور تمہارے قلب کو نورانیت حاصل ہوگی اور لوگ تمہارے ہاتھ سے محفوظ رہیں گے۔'' (میزان الحکمہ، ۲:۱۶۶۷)

ان روایات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ فکری ارتقاء اور خاموشی کے درمیان گہرا تعلق ہے۔ اس کی وجہ بھی ظاہر ہے، اس لئے کہ انسان کی بہت سی فکری صلاحیتیں فضول اور بیہودہ باتوں میں ضائع ہو جاتی ہیں۔ جب انسان خاموشی اختیار کرتا ہے تو یہ ساری توانائیاں ایک مرکز پر جمع ہو جاتی ہیں۔ فکر مصروف عمل ہو جاتی ہے اور علم و حکمت کے ابواب انسان کے دل پر کھلتے چلے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں میں یہ بات معروف ہے کہ زیادہ باتیں کرنا کم عقلی کی نشانی ہے۔

۴۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خاموشی اہم ترین عبادت ہے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: (میزان الحکمہ: باب صمت)

اربع لا یصیبهن الا مومن، الصمت وهو اول العبادة............

''چار چیزیں ایسی ہیں جو صرف مومن کو ملتی ہیں۔ خاموشی جو کہ تمام عبادات کا نقطہ آغاز ہے۔۔۔۔۔۔''

۵۔ ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

كان المسيح يقول لا تكثر الكلام في غير ذكر الله فان الذين يكثرون الكلام في غير ذكر الله قاسية ولكن لا يعلمون

''اللہ کے ذکر کے سوا کوئی بات زیادہ نہ کرو، جو لوگ ذکر اللہ کے سوا دوسری باتیں زیادہ کرتے ہیں، ان کے دل سخت ہو جاتے ہیں اور انہیں اس کا علم ہی نہیں ہوتا۔'' (اصولِ کافی، ۲: ۱۱۴)

۶۔ امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان الصمت باب من ابواب الحكمة، ان الصمت يكسب المحبة انه دليل على كل خير

''خاموشی حکمت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔ خاموشی حصولِ محبت کا باعث ہوتی ہے اور ہر بھلائی کی راہ دکھاتی ہے۔'' (اصولِ کافی: ۲: ۱۱۳)

خاموشی کے حصولِ محبت کا ذریعہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بہت سی رنجشیں اور عداوتیں زبان کے بے جا استعمال کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں۔ خاموشی اختیار کرنے سے انسان ان قباحتوں سے بچ جاتا ہے۔

۷۔ خاموشی بہت سے گناہوں سے نجات کا ذریعہ اور جنت میں داخل ہونے کی کنجی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے اس سے فرمایا:

''کیا تجھے ایک ایسی بات بتاؤں جس کے ذریعے اللہ تجھے جنت میں داخل کر دے گا؟''

اس نے عرض کیا: ''یا رسولؐ اللہ! فرمایئے!''

رسولؐ اللہ نے اسے انفاق اور مشورے کے ذریعے دوستوں کی مدد کرنے کی نصیحت کرنے کے بعد فرمایا:

فاصمت لسانك الا من خير

''خیر کے علاوہ اپنی زبان بند رکھو۔'' (اصول کافی: ۲: ۱۱۳)

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: ''اگر ان صفات میں سے ایک صفت بھی تم میں پیدا ہو جائے تو وہ تمہیں جنت میں لے جائے گی۔''

۸۔ خاموشی کے نتائج میں سے ایک مثبت نتیجہ یہ ہے کہ یہ انسان کی شخصیت کو باوقار بناتی ہے۔ ایک حدیث میں امیر المومنین

علیہ السلام فرماتے ہیں:

الصمت یکسیك الوقار، ویکفیك مونة الاعتذار

''خاموشی تمہیں وقار کالباس پہناتی ہے اور تمہیں معذرت خواہی سے بچاتی ہے۔''(غررالحکم:۱۸۲۷)

جوشخص زیادہ باتیں کرتا ہے، وہ غلطیاں بھی زیادہ کرتا ہے۔اس سے اس کے وقار میں بھی کمی ہوتی ہے اور اسے بار بار معذرت خواہی کرنا پڑتی ہے۔

۹۔ یہی بات امیرالمومنین علیہ السلام نے ایک اور حدیث میں زیادہ موثر انداز میں بیان فرمائی ہے:

ان کان فی الکلام بلاغة ففی الصمت السلامة من العثار

''اگر بات کرنے میں بلاغت ہے تو خاموشی میں سلامتی ہے۔''(غررالحکم،حکمت:۳۷۱۴)

اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بعض اوقات خاموشی کلام بلیغ سے بھی بہتر ہوتی ہے۔

۱۰۔ اگرچہ اس موضوع پر احادیث کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر ہم امام حسن علیہ السلام کی اس حدیث کو بیان کر کے اس بحث کو ختم کرتے ہیں:(میزان الحکمہ،باب صمت،حدیث:۱۰۸۲۶)

نعم العون الصمت فی مواطن کثیرة وان کنت فصیحا

''اکثر مقامات پر خاموشی اچھی مددگار ہوتی ہے،خواہ تم بات کرنے میں فصیح ہو۔''

ایک غلط فہمی کا ازالہ

خاموشی کے مندرجہ بالا فوائد اور مثبت نتائج کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ بات کرنا ہر مقام پر مذموم ہے اور یہ کہ انسان کو مکمل طور پر اپنے ہونٹ سی لینے چاہئیں،اس لئے کہ بذاتِ خود یہ ایک بڑی آفت ہے۔

احادیث میں خاموشی کی تعریف کرنے کا مقصد بیہودہ اور غیر ضروری گفتگو کی حوصلہ شکنی کرنا ہے ورنہ یہ بات اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ بعض مواقع پر بات کرنا واجب اور خاموشی اختیار کرنا حرام ہے۔

یہ بات یہاں سے بخوبی واضح وعیاں ہوجاتی ہے کہ سورۂ رحمن میں''بیان''کو اللہ تعالی کی عظیم نعمتوں میں سے ایک قرار دیا گیا ہے اور قدرتِ کلام وسخن انسان کی ایک امتیازی خصوصیت اور انسان کا ایک بڑا اعزاز ہے۔

بہت سی عبادات،جیسا کہ نماز،حج کے بعض اعمال وتلاوتِ قرآن اور ذکر الٰہی،زبان کے ذریعے ہی انجام دی جاتی ہیں۔ امر بالمعروف ونہی از منکر،علوم اسلامی ودیگر علوم واجب کی تعلیم،جاہلوں کی رہنمائی،غافلوں کو متنبہ کرنا،حق وعدالت کی طرف رہنمائی اور اس قسم کے دیگر فرائض اور کارہائے خیر صرف زبان کے ذریعے ہی انجام دیئے جاسکتے ہیں۔کوئی عقلمند انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان مواقع پر خاموش رہنا چاہئے۔جو چیز انسان کی بدبختی کا سبب بنتی ہے،اسے قرب الٰہی کے سفر سے روک دیتی ہے اور تزکیہ نفس وتہذیب

اخلاق کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے، وہ ''فضول گفتگو'' ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس مسئلہ میں انسان اعتدال کی راہ اختیار کرے اور ہر قسم کے افراط تفریط سے محفوظ رہے۔

اس سلسلہ میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کا یہ ارشاد گرامی حقیقت کو مکمل طور پر آشکار کر دیتا ہے:

ایک شخص انؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا:

''یا بن رسولؐ اللہ! کلام افضل ہے یا سکوت؟''

آپؑ نے اس کے جواب میں فرمایا:

لكل واحد منهما آفات فاذا سلما من الافات فالكلام افضل من السكوت، قيل كيف ذلك يابن رسول الله قال: لان الله عزوجل مابعث الانبياء والاوصياء بالسكوت، انما بعثهم بالكلام، ولا استحقت الجنة بالسكوت ولا استوجبت ولاية بالسكوت ولا توقيت النار بالسكوت انما ذلك كلة بالكلام، ما كنت لاعدل القمر بالشمس انك تصف فضل السكوت بالكلام و لست تصف فضل الكلام بالسكوت

''ان دونوں میں سے ہر ایک کی اپنی اپنی آفات ہیں۔ جب یہ دونوں آفات سے خالی ہوں تو بات کرنا خاموشی سے افضل ہے۔ اس شخص نے کہا: یا بن رسولؐ اللہ! کیسے؟ آپؑ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور اوصیاء کو خاموشی کے ساتھ نہیں بل کہ کلام کے ساتھ معبوث فرمایا۔ خاموشی کے ذریعے جنت ہاتھ نہیں آ سکتی، خاموشی کے ذریعے انسان ولایت الٰہی کے درجہ پر فائز نہیں ہوسکتا، خاموشی کے ذریعے انسان جہنم سے نجات حاصل نہیں کرسکتا۔ یہ سب چیزیں کلام کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں۔ میں ہرگز چاند اور سورج کو برابر قرار نہیں دیتا، یہاں تک کہ خاموشی کی فضیلت بھی کلام کے ذریعے ہی بیان کی جا سکتی ہے جبکہ کلام کی فضیلت کو کبھی خاموشی کے ذریعے بیان نہیں کیا جا سکتا۔''

(بحارالانوار ۶۸: ۲۷۴)

بلاشبہ کلام اور سکوت میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا مقام اور موقع ہوتا ہے اور ہر ایک میں مثبت اور منفی پہلو پائے جاتے ہیں۔ کلام کے مثبت پہلو اس کے منفی پہلوؤں سے زیادہ ہیں۔ لیکن چونکہ اس کے مثبت پہلو اس وقت ظاہر ہوتے ہیں جب انسان کافی حد تک تہذیب نفس کے مراحل طے کر چکا ہو، اس لئے آغازِ سیر وسلوک پر خاموشی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جب سالک خواہشاتِ نفس پر غلبہ پالے اور اپنی زبان پر مسلط ہوجائے تو پھر اسے کلام کی اجازت دے دی جاتی ہے۔

ہم اس بات کو اس پیمانے پر بھی پرکھ سکتے ہیں کہ اگر ہم ایک شب و روز میں کی جانے والی گفتگو کو ریکارڈ یا محفوظ کر لیں اور بعد میں ایمانداری کے ساتھ غور سے اسے سنیں تو ہم دیکھیں گے کہ اس کا بہت کم حصہ الٰہی مقاصد یا زندگی کی ضروریات سے متعلق ہوتا ہے۔ باقی ساری گفتگو فضول ہوتی ہے جس میں ناروا اور گناہ سے آلودہ باتیں بھی کافی ہوتی ہیں یا کم از کم مشکوک اور مشتبہ ضرور ہوتی ہیں۔

خاموشی کا مقصد غیر ضروری اور بے مقصد گفتگو اور گناہ آلود گفتگو کا سد باب کرنا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ لغت میں اگر چہ ''سکوت'' اور ''صمت'' کے ایک ہی معنی بیان کئے گئے ہیں لیکن علمائے علم اخلاق نے ان دونوں کے درمیان فرق روا رکھا ہے۔ ان کے مطابق ''سکوت'' سے مراد یہ ہے کہ انسان مکمل طور پر گفتگو کو ترک کر دے جبکہ ''صمت'' کے بارے میں انہوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ بے مقصد اور غیر ضروری گفتگو کو ترک کیا جائے۔ سالکانِ راہِ خدا کیلئے اور تہذیب اخلاق و تزکیہ نفس کے لیے جو چیز ضروری ہے، وہ سکوت نہیں بلکہ صمت ہے۔

اصلاحِ زبان

سکوت و صمت کی اہمیت اور تزکیہ نفس پر اس کے مثبت آثار و نتائج کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ آفاتِ زبان کے سد باب کا ایک بنیادی طریقہ ہے، اس لئے کہ زبان علم و ثقافت اور عقیدہ و اخلاق کی کلید ہے۔ زبان کی اصلاح ان سب کی اصلاح اور زبان کا فساد ان سب کے فساد کا سبب ہے۔ بنابر ایں اصلاحِ زبان کی بحث، خاموشی کی بحث سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔

اخلاقی مباحث میں اصلاحِ زبان کی غیر معمولی اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ زبان دل کی ترجمان اور عقل کی نمائندہ ہوتی ہے۔ یہ انسان کی شخصیت کی کلید اور اس کی روح کا دریچہ ہوتی ہے۔

بالفاظِ دیگر جو چیز بھی انسان کے قلب و جان پر نقش ہوتی ہے، سب سے پہلے اس کی زبان سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ ماضی میں اطباء کسی شخص کی صحت و بیماری کو جاننے کے لیے بھی اس کی زبان کا معائنہ کیا کرتے تھے۔ اس دور میں جبکہ لیبارٹری میں کئے جانے والے ٹیسٹ، ایکسرے اور الٹرا ساؤنڈ کی سہولتیں موجود نہ تھیں، اطباء کسی شخص کی زبان پر نظر ڈال کر اس کی بیماری اور صحت کی ساری کیفیت کا مطالعہ کر لیتے تھے۔

یہی بات فکری اور اخلاقی امور پر بھی صادق آتی ہے۔ انسان کی زبان سے انسان کی اخلاقی اور فکری حالت بخوبی معلوم ہو جاتی ہے۔ انہی وجوہات کی بناء پر علمائے علم اخلاق، اصلاحِ زبان کیلئے غیر معمولی اہمیت کے قائل ہیں اور فضائل اخلاقی کی تقویت اور روحانی کمالات کے حصول کیلئے اسے ایک اہم قدم قرار دیتے ہیں۔

امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے حکیمانہ ارشادات میں اس حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

تکلموا تعرفوا فان المرء مخبوء تحت لسانه (نهج البلاغه، کلمات قصار: ۳۹۲)

''بات کروتا کہ پہچانے جاؤ،اس لئے کہ انسان کی شخصیت اس کی زبان کے نیچے پوشیدہ ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

لا يستقيم ايمان عبد حتى يستقيم قلبه، ولا يستقيم قلبه حتى يستقيم لسانه

''کسی شخص کا ایمان درست نہیں ہوسکتا جب تک اس کا قلب درست نہ ہو اور کسی شخص کا قلب درست نہیں ہوسکتا جب تک اس کی زبان درست نہ ہو۔'' (بحارالانوار ۶۸:۲۸۶،محجۃ البیضاء ۵:۱۹۵)

اس اشارے کے بعد ہم اصل بحث کی طرف لوٹتے ہیں اور چار پہلوؤں سے اس مسئلہ کو زیر بحث لاتے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت کی حیثیت سے زبان کی اہمیت۔

۲۔ اصلاحِ زبان اور اصلاحِ روح وفکر واخلاق کا باہمی تعلق۔

۳۔ آفات زبان۔

۴۔ آفاتِ زبان کی روک تھام کے قواعد۔

اب ہم ان میں سے ہر ایک کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔

۱۔اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت

جہاں تک اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہونے کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں سورۂ رحمن اور سورۂ بلد نے حق بیان ادا کر دیا ہے۔ سورۂ بلد کی آیات ۸ تا ۱۰ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَلَمْ نَجْعَلْ لَّهُ عَيْنَيْنِ ﴿٨﴾ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ﴿٩﴾ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ﴿١٠﴾

''کیا ہم نے انسان کے لیے دو آنکھیں، ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں بنائے اور اس کو دونوں (اچھی بری) راہیں بھی دکھا دیں۔''

یہ آیات انسان پر اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں کا ذکر کر رہی ہیں۔آنکھ، زبان اور ہونٹ، ہدایت کی نعمت اور خیر وشر کی معرفت کی نعمت۔

بلاشبہ انسانی اعضاء میں سے حیرت انگیز ترین عضو ہے جس کو اہم ترین ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ایسی ذمہ داری جو کسی اور عضو کو نہیں سونپی گئی۔زبان خوراک کو نگلنے میں مدد دینے کے علاوہ خوراک کو چباتے وقت اسے منہ میں ہلانے کا کام اتنی مہارت سے انجام دیتی ہے کہ خود دانتوں کے نیچے نہیں آتی۔کبھی کبھار کھانا کھاتے ہوئے جب ہماری زبان دانتوں کے نیچے آجاتی ہے اور اس کے

نتیجہ میں جو تکلیف ہم محسوس کرتے ہیں، اس سے ہم بات بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اگر زبان کو اپنے اس کام میں غیر معمولی مہارت حاصل نہ ہوتی تو ہر روز ہمیں کتنی مصیبت اٹھانا پڑتی۔

صرف یہی نہیں بلکہ کھانا کھا لینے کے بعد منہ کے اندر کی فضا اور دانتوں کی صفائی کا کام بھی زبان ہی نہایت عمدگی کے ساتھ انجام دیتی ہے۔

لیکن ان سب سے اہم مسئلہ بات کرنے کا ہے جو زبان کی انتہائی تیز اور منظم حرکات وسکنات کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہ بات بھی بہت حیرت انگیز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بات کرنے کے لیے ایسا آلہ انسان کو عطا کیا ہے کہ آسانی سے ہر وقت ہمیں دستیاب ہے، جو کبھی تھکتا بھی نہیں اور نہ ہی اسے استعمال کرنے پر کوئی اخراجات آتے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات انسان کے اندر پائی جانے والی گفتگو کی صلاحیت اور استعداد ہے جس کی مدد سے انسان اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے لامحدود الفاظ کا استعمال اور لامحدود جملے بنانے کی قدرت سے بہرہ ور ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اسے الفاظ کی تخلیق کی ایسی استعداد اور صلاحیت عطا کی ہے جس کے استعمال سے ہزاروں زبانیں معرضِ وجود میں آئی ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ الفاظ کی تخلیق کا یہ سلسلہ بھی پھیلتا جارہا ہے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مندرجہ بالا آیات میں اسے اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ایک نعمت قرار دیا ہے، اس لیے کہ بہت سے الفاظ کے تلفظ اور گفتگو میں زبان کے ساتھ ساتھ ہونٹ بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہونٹ انسان کی زبان کو قابو میں رکھنے کا ایک اہم ذریعہ اور وسیلہ بھی ہیں۔ ایک حدیث نبویؐ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان سے فرماتا ہے:

یابن آدم ان نازعك لسانك فی ماحرمت علیك فقد اعنتك بطبقتین فاطبق

''اے فرزندِ آدمؑ! اگر تیری زبان تجھے گناہ پر اکسائے تو اسے قابو میں رکھنے کے لیے میں نے تجھے دو ہونٹ دیئے ہیں۔ ایسی حالت میں اپنے ہونٹوں کو بند کر لے۔''

(مجمع البیان ۱۰: ۴۹۴، نور الثقلین ۵: ۵۸۱)

سورۂ رحمن کی پہلی چار آیات میں بھی بیان کو، جو کہ زبان کا ایک اثر اور نتیجہ ہے، اللہ تعالیٰ کی اہم ترین نعمتوں میں سے ایک نعمت قرار دیا گیا ہے۔ ان چار آیات میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے اسم مبارک ''الرحمن'' کو بیان کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی اس وسیع ترین رحمت پر دلالت کرتا ہے جو اللہ کے دوست اور دشمن سب پر چھائی ہوئی ہے۔ اس کے بعد انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمت یعنی قرآن کا ذکر ہے۔ اس کے بعد انسانی خلقت اور بعد ازاں قدرتِ بیان کو اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے:

اَلرَّحْمٰنُ ۝۱ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝۲ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝۳ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝۴

''رحمن، جس نے قرآن کی تعلیم دی۔ انسان کو پیدا کیا اور اسے بیان کی تعلیم دی۔''

اس طرح آیت میں نعمت بیان کو انسان کی خلقت کے بعد سب سے بڑی نعمتوں میں سے ایک قرار دیا گیا ہے۔ اگر ہم انسانی زندگی کی ترقی اور تہذیب وتمدن کی پیش رفت پر ایک نظر ڈالیں تو ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی یہ عظیم نعمت نہ ہوتی تو انسان اپنے تجربات ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل نہ کر سکتا اور اس طرح تہذیب وتمدن اور دین واخلاق کا پھیلنا ناممکن ہو جاتا۔

بلاشبہ اگر ایک دن یہ نعمت تمام انسانوں سے سلب کر لی جائے تو اسی دن انسانی معاشرہ زوال و پسماندگی کی تاریکی میں جا گرے گا۔

بیان کے لیے انسان کے پاس ایک آلہ ہے اور ایک اس کے استعمال کا نتیجہ۔ چونکہ ہم ان دونوں کے عادی ہو چکے ہیں، اس لئے یہ سارا عمل ہمیں بہت معمولی اور سادہ نظر آتا ہے۔ حالانکہ یہ انتہائی پیچیدہ اور ظریف ولطیف کام اور ایک بے مثال اور نہایت اہم ہنر ہے۔

اس لئے کہ ایک طرف سے آواز ایجاد کرنے کا نظام کام کر رہا ہوتا ہے، پھیپھڑوں میں بھری ہوئی ہوا آواز کی تاروں کو متحرک کرتی ہے۔ یہ آواز زبان اور ہونٹوں کے استعمال کے نتیجہ میں حروف تہجی کو پیدا کرتی ہے۔

اسی طرح الفاظ کی تخلیق جو کلام و بیان کا بنیادی ترین عنصر ہیں، نیز ایک انتہائی عجیب اور حیرت انگیز عمل ہے، اگر ہم دنیا کے مختلف علاقوں میں بولی جانے والی زبانوں کا جائزہ لیں (جن کی تعداد ماہرین لسانیات کے مطابق تین ہزار سے زیادہ ہے) تو اس مسئلہ کی اہمیت اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ یہاں پر یہ نکتہ بھی ضرور مدنظر رہے کہ الفاظ کی تخلیق کا سلسلہ کبھی نہ رکنے والا سلسلہ ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نئے الفاظ تخلیق ہوتے رہتے ہیں۔

بہر حال نعمت بیان اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمتوں میں سے ایک ہے جو انسان کے آرام وسکون اور اس کی ترقی وپیش رفت کے ساتھ گہرا تعلق رکھتی ہے۔

یہ حقیقت احادیث میں بھی وسیع پیمانے پر بیان ہوئی ہے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: (غرر الحکم، حکمت: ۹۶۴۴)

ما الانسان لو لا اللسان الا صورة ممثلة، او بهيمة مهملة

''اگر زبان نہ ہوتی تو انسان کیا ہوتا! ایک بے جان مجسمہ یا صحرا میں بھٹکتا ہوا جانور!''

امیر المومنین علیہ السلام کے اس ارشاد سے یہ اہم حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ زبان ہی کی بدولت انسان جانوروں سے الگ اور ممتاز ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

الجمال في اللسان

''انسان کا سارا جمال زبان میں ہے۔''(بحارالانوار، ۷۴:۱۴۱)

یہی بات امیرالمومنین علیہ السلام نے ایک اور حدیث میں اس طرح بیان فرمائی ہے:

الجمال فی اللسان و الکمال فی العقل (بحارالانوار،۷۵:۸۰)

''انسان کا حسن و جمال اس کی زبان میں ہے اور اس کا کمال عقل میں ہے۔''

ہم ان احادیث کو امیرالمومنین علیہ السلام کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں:

ان فی الانسان عشر خصال یظهرها لسانه: شاهد یخبر عن الضمیر، و حاکم یفصل بین الخطاب، وناطق یردبه الجواب، و شافع یدرك به الحاجة، وواصف یعرف به الاشیاء، و امیر یامر بالحسن، وواعظ ینهی عن القبیح، و معز تسکن به الاحزان، و حاضر (حامد) تجلی به الضغائن و مونق تلذبه الاسماع (کافی، ۸:۲۰)

''انسان میں دس چیزیں ایسی ہیں جو زبان سے ظاہر ہوتی ہیں:

۱۔ یہ ایک شاہد ہے جو انسان کے باطن کی خبر دیتی ہے۔
۲۔ یہ ایک قاضی ہے جو حق و باطل کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے۔
۳۔ وہ ایک ترجمان ہے جو سوالات کا جواب دیتی ہے۔
۴۔ وہ ایک شفاعت و سفارش کرنے والی ہے جس کے ذریعے انسان اپنے مقاصد کو حاصل کرتا ہے۔
۵۔ وہ ایک توصیف گر ہے جو چیزوں کے اوصاف بیان کرتی ہے۔
۶۔ وہ حاکم ہے جو نیکیوں کی طرف دعوت دیتی ہے۔
۷۔ وہ ایک واعظ ہے جو برائیوں سے روکتی ہے۔
۸۔ وہ ایک تسلی دینے والی ہے جس سے غموں کی شدت کم ہو جاتی ہے۔
۹۔ وہ ایک ایسی تعریف کرنے والی ہے جو دلوں سے دشمنی اور کینے کے زنگ کو دور کر دیتی ہے۔
۱۰۔ وہ ایسی ہنرمند ہے جو کانوں کی لذت کا سامان فراہم کرتی ہے۔

اس بحث کے اختتام کے لیے ہم محجۃ البیضاء کا ایک اقتباس آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:

اس کتاب کے مؤلف، مرحوم محسن فیض کاشانی ''آفات اللسان'' کے عنوان سے ایک بحث کا آغاز کرتے ہوئے کہتے ہیں:
''زبان اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت اور اس کی صنعت گری کا لطیف اور حیرت انگیز نمونہ ہے۔ وہ خود چھوٹی سی ہے لیکن اس کی عبادت اور گناہ دونوں ہی بہت بڑے ہیں، اس لئے کہ کفر اور ایمان کا اظہار زبان سے ہی ہوتا ہے۔ ان دونوں میں سے ایک سب سے بڑی اطاعت وعبادت ہے اور دوسرا سب سے بڑا گناہ ہے۔ کوئی چیز ایسی نہیں ہے، خواہ موجود ہو یا معدوم، خالق ہو یا مخلوق، خیالی ہو یا حقیقی، مظنون ہو یا موہوم، زبان اس کے بارے میں بات نہ کرتی ہو اور منفی یا مثبت اس کے بارے میں اظہارِ خیال نہ کرتی ہو۔

یہ ایسی خصوصیت ہے جو زبان کے علاوہ کسی اور عضو میں نہیں پائی جاتی۔ آنکھیں رنگوں اور شکلوں کو پہچاننے اور دیکھنے کے سوا اور کوئی کام انجام نہیں دیتی ہیں۔ کان صرف آوازوں کو سنتے ہیں۔ ہاتھ صرف ان چیزوں سے سروکار رکھتے ہیں جو جسمانی وجود رکھتی ہیں۔ یہی حال دیگر تمام اعضاء کا ہے۔ لیکن زبان کی ایسی کوئی حد نہیں ہے۔ اس کی جولا نگاہ نیکی میں بھی بہت وسیع ہے اور بدی میں بھی بہت پھیلی ہوئی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی زبان کو کھلا چھوڑ دے اور اس کی نگہبانی وحفاظت نہ کرے تو شیطان اسے ہر میدان میں لے جاتا ہے اور جہنم کے کنارے تک پہنچا دیتا ہے۔'' (محجۃ البیضاء، ۵:۱۹۰)

۲۔ زبان کا فکر واخلاق سے تعلق

اس میں کوئی شک نہیں کہ زبان انسان کی روح کا دریچہ ہے۔ ہر انسان کی باتوں سے معلوم ہوسکتا ہے کہ اس کی روح کی گہرائی میں کیا چھپا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ہر شخص کی بات اس کے دل وجان پر اثر انداز ہوتی ہے اور بتدریج اسے اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہے۔ اس طرح روح اور زبان ایک دوسرے پر اثر ڈالتے ہیں۔

زبان اور فکر واخلاق کے باہمی تعلق کے بارے میں سورۂ محمد کی آیت ۳۰ نہایت واضح دلیل ہے۔ اس کی رو سے کسی کی باتوں پر غور وفکر کرنے سے بخوبی اس کی اندرونی کیفیات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمانۂ قدیم میں بھی اور دورِ حاضر میں بھی لوگوں کے افکار، اسرار اور نیتوں کو جاننے کے لیے تفتیش کے دوران اس تعلق سے استفادہ کیا جاتا تھا اور کیا جاتا ہے۔

منافقین کے بارے میں اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ؕ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ۝۳۰

''اگر ہم چاہیں تو انہیں آپ کو دکھا دیں تاکہ آپ ان کو چہروں سے پہچان لیں (لیکن اس کی ضرورت نہیں ہے) آپ انہیں ان کی بات کرنے کے انداز سے پہچان سکتے ہیں اور اللہ تم سب کے اعمال کو جانتا ہے۔''

علامہ راغب اصفہانی نے اپنی مشہور کتاب ''مفردات'' میں لکھا ہے کہ ''لحن'' کے معنی یہ ہیں کہ بات کو اس کے خاص قواعدو

ضوابط سے منحرف کر دیا جائے، اسے غلط اعراب دے دیئے جائیں، یا صاف بات کرنے کی بجائے اشارہ و کنایہ میں بات کی جائے۔ اس آیت میں "لحن القول" سے یہی آخری معنی مراد ہیں، جس کے معنی یہ ہیں کہ منافقین کے اس اندازِ گفتگو سے، جس میں ایک بات کے دو معنی یا دو پہلو پائے جاتے ہیں، ان کو پہچانا جا سکتا ہے۔

ابو سعید خدری سے مروی ایک حدیث میں آیا ہے:

لحن القول بغضهم علی بن ابیطالب، و کنا نعرف المنافقین علی عهد رسول الله ببغضهم علی بن البیطالب (مجمع البیان،۹:۱۰۶)

"لحن القول سے مراد منافقین کا بغض علی علیہ السلام ہے اور ہم زمانہ رسولؐ میں منافقین کو ان کے بغض علی علیہ السلام کی وجہ سے پہچانتے تھے۔" (یعنی اس کا ایک نمایاں مصداق حضرت علی علیہ السلام سے ان کی دشمنی ہے)۔

احادیث میں انسان کے مافی الضمیر اور اس کے اندازِ گفتگو کے باہمی تعلق کے بارے میں مفصل بیانات پائے جاتے ہیں:

۱۔ ایک مشہور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

ما اضمر احد شیئا الا ظهر فی فلتات لسانه و صفحات وجهه

"انسان جو بات بھی اپنے دل میں چھپاتا ہے، وہ اس کی باتوں سے یا اس کے چہرے کے آثار سے ظاہر ہو جاتی ہے۔" (نہج البلاغہ، کلمات قصار:۲۶)

امیر المومنین علیہ السلام کا یہ بیان جو نفسیات اور تحلیل نفسی کی بنیاد اور ستون قرار دیا جا سکتا ہے، اس حقیقت کو بالکل واضح کر دیتا ہے کہ زبان انسان کی روح کا آئینہ ہوتی ہے۔

۲۔ ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

الانسان لبه لسانه

"انسان کی شخصیت کا خلاصہ اس کی زبان ہے۔" (بحار الانوار،۷۸:۵۶)

۳۔ آپؑ ہی سے ایک اور حدیث میں منقول ہے:

قلت اربعا، انزل الله تصدیقی بها فی کتابه، قلت المرء مخبوء تحت لسانه فاذا تکلم ظهر، فانزل الله تعالی و لتعرفنهم فی لحن القول، قلت فمن جهل شیئا عاداه، فانزل الله، بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمه، وقلت قیمة کل امرء ما یحسن، فانزل الله فی قصة طالوت ان الله اصطفاه علیکم وزاده بسطة فی العلم و

الجسم، و قلت القتل یقل القتل، فانزل اللہ و لکم فی القصاص حیاۃ یا اولی الالباب (بحارالانوار، ۶۸: ۲۸۳)

''میں نے رسولؐ اللہ کے زمانہ حیات میں چار باتیں کہی تھیں جن کی تصدیق اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نازل فرمائی۔ میں نے کہا تھا کہ انسان اپنی زبان کے نیچے پوشیدہ ہے جب بولتا ہے تو ظاہر ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق میں یہ آیت نازل فرمائی:

وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ط

''آپ ان کے اندازِ گفتگو سے ان کو پہچان لیں گے۔'' (سورۂ محمد: ۳۰)

میں نے کہا تھا کہ لوگ جس چیز کو نہیں جانتے، اس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق میں یہ آیت نازل فرمائی:

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ

''انہیں جس بات کا پورا علم نہیں تھا، انہوں نے اس کو جھٹلا دیا۔'' (یونس: ۳۹)

میں نے کہا تھا کہ ہر انسان کی قیمت وہ نیکی ہے جو وہ انجام دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق میں طالوت کے واقعہ میں فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ط

یعنی ''اللہ نے اسے تم پر چن لیا اور اسے علم اور جسمانی قوت میں وسعت عطا فرمائی۔'' (بقرہ: ۲۴۷)

میں نے کہا تھا کہ قصاص سے معاشرے میں قتل میں کمی ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق میں یہ آیت نازل فرمائی:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ

یعنی ''اے صاحبانِ عقل! قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے۔'' (بقرہ: ۱۷۹)

۴۔ حضرت علی علیہ السلام سے مروی ایک اور حدیث میں ہے:

یستدل علی عقل کل اولی الالباب

''کسی انسان کی بات سے اس کی عقل کی پہچان ہوتی ہے۔'' (غرر الحکم)

۵۔ نیز آپؑ ہی سے مروی ایک اور حدیث میں ہے:

ایاك والكلام فی مالا تعرف طریقة ولا تعلم حقیقته فان قولك یدل علی عقلك وعبادتك تنبوعن معرفتك

''جس چیز کا راستہ اور حقیقت تمہیں معلوم نہ ہو، اس کے بارے میں بات نہ کرو، اس لئے کہ تمہاری بات تمہاری عقل کی اور تمہاری عبادت تمہاری معرفت کی نشاندہی کرتی ہے۔'' (غرر الحکم)

مختصر یہ کہ انسان کی شخصیت اور انسانی معاشرے کی تشکیل میں زبان کا کردار انتہائی اہم اور حساس ہے، جیسا کہ مندرجہ بالا احادیث سے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اللہ کی نعمتیں انسان کے لیے عظیم سرمایہ ہیں مگر ان کی آفات اور ان کے خطرات بھی اسی قدر عظیم ہیں، جس طرح ایٹمی طاقت، اگر اس سے مثبت اور تعمیری انداز میں فائدہ اٹھایا جائے تو دنیا کو اس کی مدد سے آباد کیا جاسکتا ہے لیکن اگر اس سے ایٹم بم بنایا جائے تو چند لمحوں میں ساری دنیا کو تباہ کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ آفات اللسان یا زبان کے خطرات

جیسا کہ گزشتہ سطور میں بیان ہو چکا ہے کہ جس طرح زبان کے مثبت اور تعمیری فوائد بہت زیادہ ہیں، اسی طرح اس کے منفی اور مخرب اثرات بھی بہت زیادہ ہیں۔

محقق بزرگوار مرحوم محسن فیض کاشانی نے اپنی کتاب ''محجۃ البیضاء'' میں اور امام غزالی نے ''احیاء العلوم'' میں زبان کے گناہوں کے بارے میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ امام غزالی نے زبان کے بیس گناہوں کی فہرست دی ہے جو یہ ہیں:

۱۔ ان چیزوں کے بارے میں گفتگو کرنا جن کا انسان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

۲۔ بیہودہ اور ضرورت سے زائد گفتگو۔

۳۔ گناہ آلود چیزوں کے بارے میں گفتگو کرنا، جیسے شراب یا بدکار عورتوں کے بارے میں گفتگو کرنا۔

۴۔ جدال و مراء (جدال سے مراد وہ بحث ہے جس کا مقصد دوسرے کو ذلیل کرنا ہوتا ہے جبکہ مراء اس بحث کو کہتے ہیں جس کا مقصد اپنی برتری ظاہر کرنا ہو)۔

۵۔ گفتگو کے دوران جھگڑا کرنا اور ہٹ دھرمی سے کام لینا۔

۶۔ گفتگو کے دوران تکلف کرنا اور سجع و قافیہ کے لیے تصنع کرنا۔

۷۔ گالی گلوچ کرنا۔

۸۔ غیر مستحق کو لعنت کرنا۔

۹۔ غنا اور شاعری (اس سے مراد وہ شاعری ہے جو باطل مطالب پر مشتمل ہو یا لہو آمیز انداز میں گائی جائے)۔

۱۰۔ گھٹیا اور پست قسم کا مزاح۔

۱۱۔ دوسروں کا مذاق اڑانا اور ان کی تحقیر کرنا۔

۱۲۔ لوگوں کے راز فاش کرنا۔

۱۳۔ جھوٹا وعدہ کرنا۔

۱۴۔ جھوٹ بولنا۔

۱۵۔ چغل خوری (دو افراد کے درمیان لڑائی یا نفرت پیدا کرنے کے لیے ایک کی بات دوسرے کو بتانا)۔

۱۶۔ غیبت کرنا۔

۱۷۔ گفتگو میں منافقت (لوگوں کے سامنے ان سے اور طرح سے بات کرنا اور ان کی غیر موجودگی میں کسی اور طرح سے)۔

۱۸۔ بے جا تعریف کرنا، یا ایسے افراد کی تعریف کرنا جو اس کے مستحق نہیں ہیں۔

۱۹۔ بغیر سوچے سمجھے اور مطالعہ کئے بغیر بات کرنا۔

۲۰۔ ایسے امور کے بارے میں سوال کرنا جنہیں سمجھنا خود سوال کرنے والے کے لیے ناممکن ہو۔

اگر گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ زبان کے گناہ انہی بیس چیزوں میں منحصر اور محدود نہیں ہیں۔ شاید فیض کاشانی اور غزالی کا مقصد تمام گناہوں کو بیان کرنا نہ تھا۔ لہٰذا مندرجہ ذیل گناہوں کو بھی مذکورہ بالا فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے:

۱۔ تہمت لگانا۔

۲۔ جھوٹی گواہی دینا۔

۳۔ خودستائی یعنی اپنے منہ میاں مٹھو۔

۴۔ بے بنیاد افواہیں پھیلانا یا بے حیائی و بدکاری کی نشر و اشاعت کرنا۔

۵۔ سخت لہجہ میں اور بے ادبی کے ساتھ گفتگو کرنا۔

۶۔ کسی بات پر بے جا اصرار کرنا (جیسا کہ بنی اسرائیل نے اس گائے کے بارے میں کیا جس کے ذبح کرنے کا انہیں حکم دیا گیا تھا)۔

۷۔ زبان سے کسی کو تکلیف پہنچانا، بالفاظ دیگر زبان سے گھاؤ لگانا۔

۸۔ ایسے شخص کی مذمت کرنا جو مذمت کا مستحق نہ ہو۔

۹۔ زبان سے ناشکری کے کلمات ادا کرنا۔

۱۰۔ تبلیغ باطل، ترغیب گناہ، امر بہ منکر و نہی از معروف۔

شاید یہ بتانا بھی ضروری نہ ہو کہ یہ تیس گناہ بھی زبان کے گناہوں کی مکمل فہرست نہیں ہے بلکہ گناہانِ زبان میں سے زیادہ نمایاں گناہ ہیں۔

لیکن اس نکتہ کا ذکر بھی ضروری ہے کہ بعض حضرات اس سلسلہ میں افراط کی جانب نکل گئے اور بعض اوقات ان گناہوں کو بھی گناہانِ زبان کی فہرست میں لے آئے جن کا زبان سے کوئی تعلق نہیں ہے، مثلاً فقر و ناداری کا ذکر کرنا، دین میں بدعت گزاری کرنا، تفسیر بالرائے اور جاسوسی وغیرہ۔ ان اعمال میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر ایک مستقل گناہ ہے، جو ممکن ہے زبان سے، قلم سے یا کسی اور ذریعے سے انجام دیئے جائیں۔ ان کو گناہانِ زبان میں شمار کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اگر اس انداز سے سوچنا شروع کر دیں تو پھر سارے گناہ اور اخلاقی رذایل مثلاً ریا، حسد، تکبر، قتل، زنا وغیرہ کو کسی نہ کسی طرح زبان کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے۔

بعض اوقات ایک ہی گناہ کی مختلف صورتوں کو ایک مستقل گناہ قرار دیا جاتا ہے، مثلاً استاد کے ساتھ بدزبان ماں باپ کے ساتھ بدزبانی اور دوسرں کو برے ناموں سے پکارنے کو الگ الگ گناہ شمار کیا گیا ہے، حالانکہ یہ ایک ہی گناہ کی مختلف شکلیں ہیں۔

لہٰذا بہتر ہے کہ ہر جگہ کی طرح یہاں بھی افراط و تفریط سے اجتناب کیا جائے۔ اگر چہ اس تقسیم سے اصل بحث پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

۴۔ خطراتِ زبان سے بچنے کے کلی اصول

اب جبکہ یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ زبان اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہونے کے باوجود کس قدر خطرناک ہو سکتی ہے، یہاں تک کہ یہ بہت سے گناہوں کی بنیاد واقع ہو جاتی ہے اور انسان کی سعادت کو خاکستر کر سکتی ہے، لہٰذا یہ فکر کرنی چاہئے کہ وہ کون سے اصول ہیں جن کی پابندی کر کے ان خطرات سے محفوظ رہا جا سکتا ہے یا کم از کم حد تک پہنچایا جا سکتا ہے۔

احادیث معصومینؑ، علمائے اخلاق کے اقوال اور عارفانِ حق کے ارشادات سے ایسے امور کی نشاندہی ہوتی ہے جنہیں ہم آفاتِ زبان کا مقابلہ کرنے کے عمومی اصولوں کے نام سے بیان کر رہے ہیں:

ا۔ خطرات زبان کی طرف سنجیدہ توجہ

ہر خطرناک چیز کے خطرات سے بچنے کے لیے سب سے پہلے اس کے خطرات کی طرف پوری طرح سے توجہ دینا ضروری ہے۔ ہر روز صبح کے وقت بیدار ہونے پر انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو نصیحت کرے کہ دن بھر خطراتِ زبان سے محفوظ رہنے کی کوشش کرتا رہے، اس لئے کہ یہ وہ عضو ہے جو انسان کو سعادت کی بلندیوں تک بھی لے جاتا ہے اور شقاوت و بدبختی کی ہولناک پستیوں میں بھی پھینک دیتا ہے۔ اگر اس سے غفلت کی جائے تو ایک خونخوار درندے کی طرح انسان کو ہلاک کر دیتا ہے۔

یہ بات احادیث میں انتہائی حسین انداز میں بیان کی گئی ہے:

ایک حدیث میں سعید بن جبیر رسولؐ اللہ سے نقل کرتے ہیں:

اذا اصبح ابن آدم اصبحت الا عضاء کلها تستکفی اللسان انی تقول اتق الله

فينا فانك ان استقمت استقمنا و ان اعوججت اعوججنا

''جب فرزند آدم صبح بیدار ہوتا ہے تو اس کے تمام اعضاء زبان کو خبردار کرتے ہیں کہ ہمارے بارے میں اللہ سے ڈرو، اس لئے کہ اگر تم سیدھی راہ پر چلو تو ہم بھی سیدھی راہ پر ہوتے ہیں اور اگر تم ٹیڑھے راستوں پر چلو تو ہم بھی ٹیڑھے راستوں پر چلنے لگتے ہیں۔'' (محجۃ البیضاء، ۵: ۱۹۳)

ایک اور حدیث میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان لسان ابن آدم يشرف على جميع جوارحه كل صباح فيقول كيف اصبحتم؟ فيقولون بخير ان تركتنا و يقولون الله فينا، و يناشدونه و يقولون انما نثاب و تعاقب بك

''انسان کی زبان ہر روز صبح کے وقت اس کے تمام اعضاء پر نظر ڈالتی ہے اور کہتی ہے: تم نے کس حال میں صبح کی؟ وہ کہتے ہیں: خیریت کے ساتھ، اگر تم نے ہمیں اسی حال پر رہنے دیا تو! (پھر وہ اسے کہتے ہیں) ہمارے بارے میں اللہ سے ڈرو، پھر اسے قسم دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تیری ہی وجہ سے ہم ثواب یا عذاب کے مستحق بنتے ہیں۔'' (اصولِ کافی، ۲: ۱۱۵)

۲۔خاموشی

گزشتہ صفحات میں ہم خاموشی کی اہمیت کے بارے میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں جس میں خاموشی کی اہمیت کے بارے میں بہت سی روایات نقل کی گئیں۔قرآنی آیات میں بھی خاموشی کی اہمیت کے بارے میں اشارات پائے گئے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان جس قدر کم بولے گا، اسی قدر اس کی غلطیاں کم ہوں گی اور جس قدر اس کی خاموشی زیادہ ہوگی، اسی قدر اسے زیادہ سلامتی نصیب ہوگی۔

اس کے علاوہ خاموشی کی زیادہ سے زیادہ مشق سے انسان کو اپنی زبان پر زیادہ سے زیادہ اختیار اور قابو حاصل ہوتا ہے اور انسان اس منزل پر پہنچ جاتا ہے جہاں وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے سوا کوئی بات نہیں کرتا۔

س یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ خاموشی سے مراد مکمل خاموشی نہیں ہے، اس لئے کہ انسان کی زندگی کی بہت سی مادی اور معنوی ضروریات کی تکمیل، کئی عبادات و اطاعات، علوم و معارف کی نشر و اشاعت اور لوگوں کے امور کی اصلاح صرف بات کرنے اور زبان کے استعمال سے ہی ممکن ہوتی ہے۔ یہاں خاموشی سے مراد قلتِ کلام ہے، یعنی ایسی باتوں سے پرہیز کرنا جو فتنہ و فساد یا گناہ کا باعث ہوں، یا مشکوک اور بے معنی ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

من کثر کلامه کثر خطوه، و من کثر خطوه قل حیاوه، و من قل حیاوه قل ورعه، و من قل ورعه مات قلبه، و من مات قلبه دخل النار

''جو زیادہ بولتا ہے، اس کی خطائیں بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ جس کی خطائیں زیادہ ہوں، اس کی حیا کم ہو جاتی ہے، جس کی حیا کم ہوجائے اس کا دل مردہ ہوجاتا ہے اور جس کا دل مردہ ہوجائے، وہ جہنم میں جاتا ہے۔'' (نہج البلاغہ، کلماتِ قصار: ۳۴۹)

آپؑ ہی سے مروی ایک اور حدیث میں ہے:

الکلام کالدواء قلیله ینفع و کثیره قاتل

''کلام دوا کی مانند ہے، اگر کم ہو تو صحت مندی کا باعث ہوتی ہے، زیادہ ہو تو مار ڈالتی ہے۔''

۳۔ حفاظت زبان (بولنے سے پہلے سوچنا)

اگر انسان بولنے سے پہلے سوچے تو زبان کی بہت سی لغزشوں سے محفوظ ہوجاتا ہے۔ سوچے سمجھے بغیر یا مطالعہ کے بغیر بات کرنا انسان کو مختلف قسم کے گناہانِ زبان کی دلدل میں دھکیل دیتا ہے۔

ایک حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

ان لسان المومن وراء قلبه، فاذا اراد ان یتکلم بشیء تدبره بقلبه، ثم امضاه بلسانه، و ان لسان المنافق امام قلبه، فاذاهم بشیء امضاه بلسانه و لم یتدبره بقلبه

''مومن کی زبان اس کے دل کے پیچھے ہوتی ہے، جب وہ کچھ کہنے کا ارادہ کرتا ہے تو پہلے دل سے غور و فکر کرتا ہے، پھر اسے زبان سے ادا کرتا ہے جبکہ منافق کی زبان اس کے دل کے آگے ہوتی ہے، جب وہ کچھ کہنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کہہ دیتا ہے اور اس کے بارے میں غور و فکر نہیں کرتا۔''

(محجۃ البیضاء، ۵:۱۹۵)

یہی بات اختلافِ الفاظ کے ساتھ نہج البلاغہ کے خطبہ ۱۷۶ میں امیر المومنین علیہ السلام نے بھی بیان فرمائی ہے۔ اسی حقیقت کو حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

قلب الاحمق فی فمه و فم الحکیم فی قلبه (بحارالانوار، ۷۵:۳۷۴)

''احمق کا دل اس کے منہ میں ہوتا ہے جبکہ عاقل کا منہ اس کے دل میں ہوتا ہے۔''

ظاہر سی بات ہے کہ یہاں قلب سے مراد عقل وفکر ہے اور زبان کے دل کے آگے یا پیچھے ہونے کا مطلب بات کے معنی میں غور وفکر کرنا یا نہ کرنا ہے۔

واقعی یہ کتنا اچھا ہو اگر ہم بات کرنے سے پہلے سوچیں اور دیکھیں کہ یہ بات کرنے کا محرک کیا ہے، اس بات کے نتائج کیا ہوں گے؟ آیا یہ بات بے معنی، مضر یا کسی مومن کی توہین یا ظالم کی حمایت تو نہیں ہے؟ کیا یہ بات اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کیلئے ہے؟ امر بالمعروف ونہی از منکر کیلئے ہے؟ مظلوم کی حمایت اور ظالم کی مخالفت پر مبنی ہے؟ اللہ کی رضا اور بندگانِ خدا کی خوشی کا باعث ہے؟

اس گفتگو کو ہم امیر المومنین علیہ السلام کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں جو مندرجہ بالا تمام مطالب کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اور انسان کے دل کی نورانیت کا باعث بن سکتی ہے:

ان احببت سلامة نفسك وستر معايبك فاقلل كلامك و اكثر صمتك يتوفر فكرك ويستنر قلبك

''اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے نفس کو سلامتی نصیب ہو اور تمہارے عیب پوشیدہ رہیں تو اپنی گفتگو کو کم اور خاموشی کو زیادہ کرو۔ اس سے تمہاری فکر کو قوت اور دل کو نورانیت ملے گی۔'' (تصنیف غرر الحکم، صفحہ ۲۱۶)

یہ تہذیب نفس اور پاکیزگی اخلاق میں زبان کے کردار اور حفاظت زبان کے کلی اصولوں کا خلاصہ تھا۔ البتہ غیبت، تہمت، چغل خوری، برائی اور باطل کی نشر واشاعت جیسے موضوعات پر ہم انشاءاللہ اس کتاب کی دوسری جلد میں تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

خودشناسی اور خداشناسی

اصلاحِ نفس، تہذیبِ اخلاق اور انسانی صفات کے حصول اور پرورش میں ایک اور اہم قدم خودشناسی ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ انسان اپنے نفس کی معرفت حاصل کئے بغیر کمالاتِ انسانی تک پہنچ جائے، اپنے عیوب کی اصلاح کر سکے اور اپنے آپ کو اخلاقی رذائل سے پاک کر سکے۔

جب تک بیمار کو اپنی بیماری کی خبر نہ ہو، کیا وہ طبیب کے پاس جائے گا؟

جو شخص سفر میں بھٹک گیا ہو، جب تک اسے احساس نہ ہو کہ وہ راستہ بھول گیا ہے، کیا وہ کسی رہنما کی ضرورت محسوس کر سکتا ہے؟

جب تک انسان کو احساس نہ ہو کہ دشمن اس کے گھر کے قریب ہے اور اس پر حملہ کرنے والا ہے، کیا وہ اپنی حفاظت کے لیے کوئی قدم اٹھا سکتا ہے؟

ان تمام سوالات کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔اسی طرح جو شخص اپنے آپ کو نہ پہچانے، اپنے عیوب اور نقائص سے باخبر نہ ہو، ہرگز اپنی اصلاح کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا اور نہ ہی کسی مسیحا نفس روحانی طبیب کی طرف رجوع کرسکتا ہے۔اس مختصر تمہید کے بعد ہم خودشناسی اور تہذیب نفس کے باہمی تعلق اور خداشناسی و تہذیب نفس کے باہمی ربط و تعلق کا جائزہ لیتے ہیں۔

ا۔خودشناسی اور تہذیب نفس کا باہمی تعلق

خودشناسی اور تہذیب نفس کے باہمی تعلق کے دلائل نہایت واضح ہیں جنہیں ذیل میں بیان کیا جارہا ہے:

ا۔ انسان خودشناسی کے ذریعے انسانی نفس کی عظمت اور کرامت کو اور روح کی اہمیت کو، جو کہ انوارِ الٰہی اور نفخۂ ربانی کا پرتو ہے، اچھی طرح سے پہچان سکتا ہے اور اس حقیقت کا ادراک کرلیتا ہے کہ اس گوہر گراں بہا کو کم قیمت پر فروخت نہیں کرنا چاہئے اور اسے کسی قیمت پر ضائع نہیں کرنا چاہئے۔

۲۔ خودشناسی کے ذریعے انسان ہوائے نفسانی کے خطرات، شہوت کے محرکات اور سعادت کے ساتھ ان کے تضاد کو اچھی طرح سمجھ لیتا ہے اور اپنے آپ کو ان کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو نہ پہچانے، وہ ان محرکات سے بے خبر رہ جاتا ہے۔اس کی حالت اس شخص جیسی ہوتی ہے جسے ایک خطرناک دشمن نے گھیرا ہوا ہو مگر وہ اس سے غافل ہو۔ظاہر سی بات ہے کہ ایسا شخص اس دشمن سے مقابلہ کرنے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دشمن کے مہلک وار کا نشانہ بن جائے گا۔

۳۔ جو انسان اپنے آپ کو پہچان لیتا ہے، وہ ان صلاحیتوں اور قابلیتوں کو پہچان لیتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر رکھی ہیں۔ ان صلاحیتوں اور قابلیتوں کو پہچان لینے کے بعد اس کے اندر ان کو پروان چڑھانے کا شوق پیدا ہوتا ہے تاکہ وہ اپنے اندر چھپے ہوئے خزانوں کو تلاش کرسکے اور اپنے جوہر ذات کو ہویدا و آشکار کرسکے۔

جو شخص اپنی معرفت نہیں رکھتا، اس کی حالت اس شخص جیسی ہوتی ہے جس کے گھر میں جگہ جگہ قیمتی خزانے دفن ہوں لیکن وہ ان کو نہ جانتا ہو۔ممکن ہے ایسا شخص بھوک سے مرجائے جبکہ اس کے قدموں تلے اتنا بڑا خزانہ چھپا ہوا ہو جس سے ہزاروں افراد کو کھانا کھلایا جاسکتا ہو۔

۴۔ تمام اخلاقی برائیوں کی جڑیں انسان کے اندر پائی جاتی ہیں۔خودشناسی کی مدد سے انسان ان کو اچھی طرح پہچان سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان بیماریوں کا علاج آسان ہوجاتا ہے۔اس طرح تزکیہ نفس اور تہذیب اخلاق کی منزل تک پہنچنے کی راہ اس کے لیے ہموار ہوجاتی ہے۔

۵۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ خودشناسی، خداشناسی کا بہترین ذریعہ ہے جبکہ خداشناسی اور اللہ کی صفاتِ جلال و جمال کی پہچان اخلاقی فضائل کی نشوونما اور اخلاقی پستیوں سے نجات کے حصول اور اوجِ فضائل تک پہنچنے میں فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔

اگر گزشتہ مطالبہ میں اس جملے کا بھی اضافہ کر لیا جائے کہ رذائل اخلاقی انسان کو تباہی سے دو چار کر دیتے ہیں، انسانی معاشرے کو خطرناک بحرانوں میں گرفتار کر دیتے ہیں، زندگی کے شہد کو کڑوے زہراب میں بدل دیتے ہیں تو خودشناسی اور خودآ گاہی کی اہمیت مزید واضح و آشکار ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

کارل مینگز اپنی کتاب ''تحلیلِ نفسی کے معجزات'' میں لکھتا ہے:

''خودآ گاہی کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں اپنی مثبت اور محبت انگیز طاقتوں کا بھی علم ہو اور ان منفی ومخرب قوتوں کا بھی علم ہو جو ہمیں بدقسمتی سے دو چار کرسکتی ہیں۔ان منفی طاقتوں کو نظر انداز کرنا اور دوسروں کے اندر ان کے وجود کی بات نہ کرنا زندگی کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتا ہے۔''

''انسان موجودِ ناشناختہ'' جو ایک مشہور ومعروف کتاب ہے، اس میں ایک جملہ ہے جو ہماری بحث کی اہمیت کو واضح کر دیتا ہے:

''بدقسمتی سے صنعتی تمدن میں انسان کی پہچان پر توجہ نہیں دی گئی اور زندگی کا لائحہ عمل انسان کی فطری اور طبیعی بنیادوں پر وضع نہیں کیا گیا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ظاہری حسن ورعنائی کے باوجود انسان کو فلاح کی راہ نہ دکھا سکا۔سائنسی ترقی درحقیقت کسی منصوبہ بندی کے مطابق عمل میں نہیں آئی بلکہ تقریباً اتفاقی تھی۔اگر گلیلیو، نیوٹن اور لیوازے اپنی فکری اور ذہنی صلاحیتوں کو انسان کے جسم اور روح کے مطالعہ پر صرف کرتے تو آج دنیا کی شکل کچھ اور ہوتی۔'' (صفحہ:۲۲)

یہی وجہ ہے کہ اللہ نے ہوس ران سرکشوں کی سزا خود فراموشی مقرر کی ہے اور مسلمانوں کو خبردار کر رہا ہے کہ:

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ⑲

''اور ان لوگوں کی طرح سے نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انکو ان کے اپنے بارے میں بھلاوے میں ڈال دیا۔یہی لوگ فاسق ہیں۔'' (حشر:۱۹)

۲۔خودشناسی احادیث کی روشنی میں

رسولؐ اللہ اور آئمہ معصومینؑ کی احادیث میں خودشناسی کے بارے میں بہت اہم اور قابل قدر مطالب بیان ہوئے ہیں جو ہمیں اس سلسلہ میں ہر قسم کی تشریح ووضاحت سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔

۱۔ امیر المومنین علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

نال الفوز الاکبر من ظفر بمعرفة النفس (غرر الحکم، حدیث:۹۹۶۵)

''جس نے اپنی معرفت حاصل کر لی، اس نے سب سے بڑی کامیابی حاصل کر لی۔''

۲۔ اسی کے نقطہ مقابل میں آپؑ ہی سے مروی ایک حدیث میں آیا ہے:

من لم یعرف نفسه بعد عن سبیل النجاة و خبط فی الضلال و الجهالات

(غررالحکم، حدیث: ۹۰۳۴)

''جس نے اپنے آپ کو نہیں پہچانا، وہ راہِ نجات سے دور ہو گیا اور گمراہی و جہالت میں گر گیا۔''

۳۔ ایک اور حدیث میں امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

العارف من عرف نفسه فاعتقها و نزهها عن کل ما یبعدها

''حقیقی عارف وہ ہے جو اپنے نفس کی معرفت حاصل کرے اور اسے خواہشات کی قید سے آزاد کروائے اور ہر اس چیز سے پاک کرے جو اسے سعادت سے دور کرتی ہو۔''

(غررالحکم بحوالہ المیز ان، ۶: ۱۷۳)

۴۔ نیز آپؑ ہی سے ایک اور حدیث میں ہے:

اکثر الناس معرفة لنفسه اخوفهم لربه (غررالحکم، حدیث ۳۱۲۶)

''جو شخص سب سے زیادہ اپنے نفس کی معرفت رکھتا ہو، وہ سب سے زیادہ اپنے رب سے ڈرتا ہے۔''

یہ حدیث خوفِ خدا اور خودشناسی کے قریبی تعلق کو بخوبی بیان کرتی ہے جبکہ خوف خدا تہذیب نفس کا اہم ذریعہ ہے۔

۵۔ امیرالمومنین علیہ السلام ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں:

من عرفه نفسه جاهدها، و من جهل نفسه اهملها

''جو اپنے نفس کو پہچان لے، اس کے خلاف جہاد کرتا ہے اور جو اپنے نفس کے بارے میں جاہل ہوتا ہے، وہ اسے کھلا چھوڑ دیتا ہے۔'' (میزان الحکمہ، ۳: ۱۸۸۱ بحوالہ المیز ان)۔

اس حدیث کی رو سے نفس کے خلاف جہاد، جسے جہادِ اکبر بھی کہا جاتا ہے، خودشناسی پر موقوف ہے۔

۶۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

من کرمت علیه نفسه هانت علیه شهواته

''جو اپنے آپ کو محترم جانتا ہے، وہ خواہشاتِ نفس کو حقیر جانتا ہے۔'' (یعنی آسانی سے اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی نہیں کرتا)۔ (نہج البلاغہ، کلماتِ قصار: ۲۰۹)

۷۔ جس طرح خود شناسی تہذیب نفس اور اخلاقی ارتقاء کی بنیاد فراہم کرتی ہے، اسی طرح نفس کی حقیقت سے جاہل ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان تمام اخلاقی اقدار سے بیگانہ اور اللہ سے دور ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ایک حدیث میں حضرت امام علی نقی علیہ السلام فرماتے ہیں:

من ھانت علیہ نفسہ فلا تامن شرہ (تحف العقول، کلماتِ قصار امام علی نقی علیہ السلام)

''جو شخص عزتِ نفس سے محروم ہے، اس کے شر سے اپنے آپ کو محفوظ نہ سمجھو۔''

مندرجہ بالا احادیث سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ خود شناسی اور معرفت نفس فضائل اخلاقی کی پرورش اور روحانی ارتقاء کے بنیادی ستونوں میں سے ایک ہے۔ جب تک انسان اس مشکل اور دشوار منزل کو عبور نہیں کر لیتا، کسی بھی معنوی مقام تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے علم اخلاق اس بات پر سخت تاکید کرتے ہیں کہ رہروانِ راہِ معرفت خود شناسی کو اہمیت دیں اور اس انتہائی بنیادی اہمیت کے معاملہ سے غفلت نہ کریں۔

۳۔ خود شناسی خدا شناسی کا ذریعہ ہے

قرآن مجید انتہائی صراحت کے ساتھ فرماتا ہے:

سَنُرِيۡهِمۡ اٰيٰتِنَا فِى الۡاٰفَاقِ وَفِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُ الۡحَـقُّ ؕ

''ہم اپنی نشانیاں آفاق (کائنات کی وسعتوں) میں اور ان کے اپنے وجود میں انہیں دکھائیں گے، یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے کہ وہ حق ہے۔'' (فصلت: ۵۳)

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَفِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۲۱﴾

''اور تمہارے وجود کے اندر اس کی نشانیاں ہیں، کیا تم دیکھتے نہیں؟'' (ذاریات: ۲۱)

بعض محققین نے اس آیت سے بھی یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ معرفتِ نفس، معرفت خدا کا ذریعہ ہے۔

وَاِذۡ اَخَذَ رَبُّكَ مِنۡۢ بَنِىۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُهُوۡرِهِمۡ ذُرِّيَّتَهُمۡ وَاَشۡهَدَهُمۡ عَلٰۤى اَنۡفُسِهِمۡ ۚ اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ ؕ قَالُوۡا بَلٰى ۛۚ شَهِدۡنَا ۛۚ (اعراف: ۱۷۲)

''جب تیرے رب نے بنی آدم کی پشت سے ان کی ذریت کو نکالا اور انہیں خود ان پر گواہ قرار دیا (اور ان کے وجود کے اسرار انہیں دکھا کر فرمایا) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے کہا: ہم گواہی دیتے ہیں۔''

تفسیر المیزان میں ہے:

''انسان جس قدر متکبر ہو، وسائلِ زندگی کی فراوانی اسے جس قدر بھی مغرور بنا دے، وہ اس حقیقت کا انکار نہیں کرسکتا کہ وہ اپنے وجود کا مالک نہیں ہے، نہ ہی اپنے امور کی تدبیر میں مستقل ہے۔ اگر وہ اپنا مالک ہوتا تو موت اور زندگی کے دیگر آلام ومصائب کو اپنے آپ سے دور رکھتا۔ اگر اپنے امور کی تدبیر میں مستقل ہوتا تو کبھی عالم اسباب کے سامنے عاجز ومجبور نہ ہوتا۔ لہٰذا یہ بات ثابت ہے کہ مالک ومدبر رب کا محتاج ہونا انسان کے وجود کے عناصر ترکیبی میں سے ہے۔ فقر وحاجت مندی انسان کی پیشانی پر لکھی ہوئی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کسی میں ذرہ بھر شعور ہو، وہ اس کا انکار نہیں کرسکتا اور اس مسئلہ میں عالم اور جاہل کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

بنا برایں انسان انسانیت کے جس مقام پر بھی ہو، وہ اس حقیقت کو بخوبی درک کرتا ہے کہ اس کا ایک مالک اور مدبر رب ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنی ذاتی حاجت مندی کو تو دیکھ رہا ہو اور اپنی اس حقیقت کو نہ دیکھ سکے۔

لہٰذا یہ آیت ایک ایسی حقیقت کی طرف اشارہ کررہی ہے جسے انسان دنیوی زندگی میں محسوس کرتا ہے، وہ یہ کہ وہ اپنی زندگی کے تمام امور میں ایک ایسی ہستی کا محتاج ہے جو اس کی اپنی ذات سے باہر ہے۔ بنا برایں اس آیہ شریفہ کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے انسان کو اس کی نیازمندی اور احتیاج سے آگاہ کردیا اور انہوں نے ہماری ربوبیت کا اعتراف کرلیا۔'' (المیزان ۸:۷: ۳۰۷)

اس طرح یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ نفس انسان اور اس کی خصوصیات کی معرفت، اللہ کی معرفت کا ذریعہ ہے۔

مشہور حدیث ''من عرف نفسه عرف ربه''، ''جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا، اس نے اپنے رب کو پہچان لیا''، اسی حقیقت کو بیان کررہی ہے۔ یہ حدیث الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ رسولؐ اللہ اور امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے۔ بحار الانوار میں یہ حدیث کتاب ادریسؑ کے صحیفہ چہارم سے، جو صحیفۂ معرفت کے نام سے موسوم ہے، اس طرح نقل ہوئی ہے:

من عرف الخلق عرف الخالق، و من عرف الرزق عرف الرازق، و من عرف نفسه عرف ربه (بحار الانوار، ۹۲: ۴۵۶، ۵۸: ۹۹ اور ۶۶: ۲۹۳)

''جس نے مخلوق کو پہچان لیا، اس نے خالق کو پہچان لیا، جس نے رزق کو پہچان لیا، اس نے رازق کو پہچان لیا اور جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا، اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔''

علامہ طباطبائی تفسیر المیزان میں اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''شیعہ اور سنی دونوں نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور یہ ایک مشہور حدیث ہے۔''

حدیث ''من عرف نفسه'' کی سات تفسیریں

اس حدیث کی مختلف اسالیب میں تشریح وتفسیر کی گئی ہے جن میں سے چند کی طرف ذیل میں اشارہ کیا جاتا ہے:

۱۔ یہ حدیث ''برہانِ نظم'' کی طرف اشارہ کررہی ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص بھی اپنی روح وجسم کی ساخت کے حیرت انگیز پہلوؤں پر نظر ڈالے اور اس عجوبہ خلقت کے پیچیدہ اور پر اسرار نظام کو غور سے دیکھے تو اللہ کی معرفت کا دروازہ اس کے اوپر کھل جائے گا، اس لئے کہ یہ حیرت انگیز نظم کسی عالم وقادر مبداء کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتا۔لہٰذا اپنے نفس کی معرفت اللہ کی معرفت کا ذریعہ ہے۔

۲۔ ممکن ہے یہ حدیث ''برہانِ امکان وجوب'' کی طرف اشارہ ہو،اس لئے کہ اگر انسان اپنے وجود پر غور کرے تو یہ حقیقت اس پر آشکار ہوجائے گی کہ وہ ہر لحاظ سے غیر مستقل اور وابستہ ہے۔اس کا علم،اس کی قدرت وتوانائی،اس کی عقل وذہانت اور اس کے وجود کے تمام شاخ وبرگ،غیر مستقل اور محتاج ہیں ایک ایسی ذات کے جو مستقل اور بے نیاز ہے۔بالفاظ دیگر جو کوئی اپنے وجود کے بارے میں غور وفکر کرے،وہ لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ وہ خود ''ممکن الوجوذ'' ہے جو اپنے وجود اور تمام خصوصیات میں ''واجب الوجوذ'' کا محتاج ہے۔

۳۔ ممکن ہے یہ حدیث ''برہانِ علت ومعلول'' کی طرف اشارہ ہو،اس لئے جب انسان اپنے وجود پر غور کرتا ہے تو اس پر یہ بات کھل جاتی ہے کہ اس کے جسم وروح کسی اور علت کے معلول ہیں جس نے ایک خاص زمان ومکان میں انہیں نعمتِ وجود سے نوازا ہے۔جب انسان اپنے وجود کی علت کی جستجو کرتا ہے اور اپنے ماں باپ پر نظر ڈالتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی کسی اور علت کے معلول ہیں۔جب وہ علت ومعلول کے اس سلسلہ کو دیکھتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلۂ علت ومعلول لامتناہی نہیں ہوسکتا،اس لئے کہ اس سے تسلسل لازم آتا ہے اور تسلسل کا باطل ہونا ہر صاحب علم ودانش پر واضح ہے۔

بنابرایں علت ومعلول کے اس سلسلہ کو لامحالہ کسی مقام پر ختم ہونا ہے،یعنی ایک ایسی علت پر جو معلول نہ ہو،جسے دوسرے الفاظ میں علت العلل یا واجب الوجود کہا جاتا ہے،جس کا وجود ذاتی ہے اور جو اپنے وجود میں کسی کی محتاج نہیں ہے۔جب انسان اس لحاظ سے اپنے آپ کو پہچان لیتا ہے تو وہ اپنے رب کو بھی پالیتا ہے۔

۴۔ یہ حدیث ''برہانِ فطرت'' کی طرف بھی اشارہ ہوسکتی ہے۔جب انسان اپنے قلب وروح کی گہرائیوں اور مختلف زاویوں سے اپنے وجود کا جائزہ لیتا ہے تو دیکھتا ہے کہ توحید اور الوہیت کا نور اس کی فطرت میں ضوفشانی کررہا ہے۔اس طرح کسی قسم کے استدلال کی ضرورت محسوس کئے بغیر اپنے نفس کی معرفت سے اپنے رب کی معرفت حاصل کرلیتا ہے۔

۵۔ ممکن ہے یہ حدیث ''صفاتِ خدا'' کی طرف اشارہ کررہی ہو۔اس کے معنی یہ ہیں کہ جب انسان یہ دیکھتا ہے کہ اس کا اپنا وجود مخلوقات اور ممکنات کی صفات کا حامل ہے تو وہ اپنے رب کی صفات کو پہچان لیتا ہے۔وہ اپنی محدودیت سے اللہ تعالیٰ کے لامحدود ہونے کو سمجھ لیتا ہے،اس لئے کہ اگر اللہ بھی محدود ہوتو وہ مخلوق ہوگا۔وہ اپنے فانی ہونے سے اللہ کے باقی ہونے کو سمجھ لیتا ہے،اس لئے کہ اگر وہ بھی فانی ہوتو وہ خدا نہیں ہوسکتا۔اسی طرح وہ اپنی نیازمندی سے اللہ تعالیٰ کی بے نیازی،اپنے ضعف سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کو پہچان لیتا ہے۔یہ وہی چیز ہے جو نہج البلاغہ کے خطبۂ اول میں امیر المومنین علیہ السلام نے اس طرح بیان فرمائی ہے:

و كمال الاخلاص له نفى الصفات عنه لشهادة كل صفة انها غير الموصوف و شهادة كل موصوف انه غير الصفة

''اللہ کے لیے اپنے ایمان کو خالص کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس سے ممکنات کی نفی کی جائے، اس لئے کہ (مخلوق) کی ہر صفت اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے موصوف کی غیر ہے اور ہر موصوف اس بات پر گواہ ہے کہ وہ صفت کا غیر ہے۔''

۶۔ علامہ مجلسیؒ نے بعض علماء سے اس حدیث کی ایک اور تفسیر نقل کی ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

''انسان کی روح ایک لطیف لاہوتی موجود ہے جس نے جامۂ ناسوت زیب تن کر رکھا ہے (یعنی اس کا تعلق عالم ماورائے طبیعت سے ہے مگر وہ عالم طبیعت میں سکونت پذیر ہے) اور یہ دس پہلوؤں سے اللہ کی وحدانیت اور ربوبیت پر دلالت کرتی ہے:

۱۔ چونکہ روح بدن کی مدبر ہے، اس سے ہم یہ جان لیتے ہیں کہ کائنات کا بھی کوئی مدبر ہے۔

۲۔ چونکہ روح ایک ہے، لہٰذا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا خالق بھی ایک ہے۔

۳۔ چونکہ یہ جسم کو حرکت دینے پر قادر ہے، لہٰذا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ قادر ہے۔

۴۔ چونکہ روح بدن سے مکمل طور پر آگاہ ہوتی ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ آگاہ وخبیر ہے۔

۵۔ چونکہ اسے تمام اعضاء پر تسلط حاصل ہے، لہٰذا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ اپنی تمام مخلوقات پر مکمل تسلط رکھتا ہے۔

۶۔ چونکہ یہ بدن سے پہلے موجود تھی اور اس کے بعد بھی باقی رہے گی، یہ اللہ کے ازلی اور ابدی ہونے کی دلیل ہے۔

۷۔ چونکہ انسان اپنے نفس کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہے، اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی حقیقت کو جان لینا ممکن نہیں ہے۔

۸۔ چونکہ انسان کو جسم کے اندر روح کی جگہ نظر نہیں آتی، لہٰذا ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ بھی مکان اور محل سے بے نیاز ہے۔

۹۔ روح کو چھونا ممکن نہیں ہے، پس ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو چھونا بھی ممکن نہیں ہے۔

۱۰۔ چونکہ انسان کی روح اور نفس کو دیکھا نہیں جاسکتا، لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ خالق کو بھی دیکھنا ممکن نہیں ہے۔

(بحارالانوار،۵۸: ۹۹و۱۰۰)

۷۔ اس حدیث کی تفسیر اس طرح بھی کی گئی ہے کہ "**من عرفه نفسه عرفه ربه**" تعلیق بہ محال ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح انسان کے لیے محال ہے کہ وہ اپنے نفس اور اپنی روح کی حقیقت کو پہچان سکے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی حقیقی اور مکمل معرفت بھی ممکن نہیں ہے۔

لیکن یہ تفسیر بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے۔ البتہ اس سے پہلے بیان کی گئی تفاسیر مناسب ہیں اور اس حدیث کے یہ تمام معنی باہم مراد لینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

بلاشبہ جو شخص اپنے آپ کو پہچان لے، وہ اللہ کو پہچان لے گا۔ خودشناسی خداشناسی کا ذریعہ ہے اور خداشناسی یقینا تہذیب اخلاق اور قلب وروح کو اخلاقی آلائشات سے پاک کرنے کا موثر ترین اور یقینی ذریعہ ہے، اس لئے کہ اس کی پاک ذات تمام کمالات وفضائل کا سرچشمہ ہے۔ یہاں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ سیر وسلوک اور تہذیب نفس کا سب سے اہم قدم خودشناسی ہے۔ لیکن خودشناسی کی منزل تک پہنچنے میں بھی بہت سی رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔

خودشناسی کی رکاوٹیں

جسمانی بیماریوں کے علاج کا پہلا قدم بیماری کی تشخیص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے جدید دور میں مختلف ذرائع کی مدد سے بیماری کی کمیت وکیفیت کے بارے میں بہتر آگاہی حاصل ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے بیماریوں کا علاج کافی آسان ہوگیا ہے۔

روحانی بیماریوں اور اخلاقی آلائشات کا علاج بھی اسی طرح ہے۔ جب تک اخلاقی معالجین کی ہدایات کے مطابق اخلاقی رذائل کی صحیح طرح سے تشخیص نہ کرلی جائے، ان کا علاج ممکن نہیں ہے۔

اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ خطرناک جسمانی بیماریوں کی علامتوں کو دیکھنے کے باوجود، جب ذات کی بنیاد پر اپنی ان خطرناک بیماریوں کا اعتراف نہیں کرتے۔ ایسے افراد عموماً اس وقت بیماری کا اعتراف کرتے ہیں جب بیماری مہلک سرحدوں میں داخل ہوجاتی ہے۔ مگر اس وقت اس اعتراف کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور بیماری کا علاج ناممکن یا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔

اخلاقی بیماریوں کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ عام طور پر حب ذات میں مبتلا انسان اپنے اخلاقی عیوب کا اعتراف نہیں کرتے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ اپنی اخلاقی برائیوں کی تاویل کرتے ہیں اور ان کا جواز ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے اندر کوئی اخلاقی خامی سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اس طرح وہ ان اخلاقی بیماریوں کی تشخیص کا راستہ ہی بند کردیتے ہیں۔

خودشناسی اور اپنے عیوب کا اعتراف کرنا بڑی جرأت وہمت کا کام ہے جس کے لیے آہنی عزم وارادے کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ انسان ان عیبوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ اگر کبھی اس کا کوئی عیب ظاہر ہوجائے تو وہ چالاکی سے اس کی تاویلیں کرنے لگتا ہے اور اس کا جواز ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔

بعض اوقات تو اپنے عیوب کو پہچاننا انتہائی وحشت ناک ہوتا ہے اور اکثر لوگ اس وحشت کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں کرتے۔ لیکن اس کی انہیں بہت بھاری قیمت چکانا پڑتی ہے۔

بہرحال حب ذات، خود پسندی اور اپنے آپ کو برتر سمجھنا، خودشناسی کی منزل تک پہنچنے میں بنیادی رکاوٹ ہے۔ جب تک یہ حجاب برطرف نہیں ہوتا، خودشناسی ممکن نہیں ہوسکتی اور جب تک انسان خودشناسی کا مرحلہ طے نہ کرلے اور اپنی خامیوں سے آگاہ نہ ہوجائے، تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفس کا راستہ اس پر بند رہتا ہے۔

اس سلسلہ میں رسولؐ اللہ اور آئمہ معصومینؑ کی طرف سے جو ارشادات ہم تک پہنچے ہیں، وہ اس بات کی صداقت کے زندہ گواہ ہیں۔ رسولؐ اللہ سے مروی ایک حدیث میں ہے:

اذا اراد اللہ بعبد خیرا فقھه فی الدین وزھده فی الدنیا و بصره عیوبه

''جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ نیکی کا ارادہ کرتا ہے تو اسے دین کی سمجھ اور دنیا میں زہد عطا کر دیتا ہے اور اس کے عیوب اس کو دکھا دیتا ہے۔'' (نہج الفصاحہ:۲۶)

حضرت علی علیہ السلام ایک مختصر مگر پر مغز جملے میں فرماتے ہیں:

جھل المرء بعیوبه من اکبر ذنوبه

''اپنے عیوب سے جاہل رہنا سب سے بڑا گناہ ہے۔'' (بحارالانوار، ۷۴:۴۱۹)

اب یہ سوال پیش آتا ہے کہ انسان کے لیے کیونکر ممکن ہے کہ وہ خود پسندی کے اس حجاب کو پارہ کر کے اپنے عیوب سے آگاہ ہو جائے۔

مرحوم فیض کاشانی اس سلسلہ میں ایک مفید بحث میں اپنے عیوب کو پہچاننے کے چار راستے بیان فرماتے ہیں:

پہلا راستہ یہ ہے کہ انسان کسی ایسے استاد کی تلاش کرے جو نفس کے عیوب سے آگاہ ہو اور اخلاقی برائیوں کے مخفی پہلوؤں سے باخبر ہو۔ جب انسان ایسا استاد تلاش کر لے تو اسے اپنے نفس کا حاکم بنا لے اور اس کی رہنمائی میں قدم آگے بڑھائے۔ مگر ہمارے دور میں اس کے امکانات بہت کم ہیں۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ ایک سچے اور ایماندار دوست کی جستجو کی جائے اور اس سے درخواست کرے کہ اس کے معاملات پر نظر رکھے اور جب کبھی اس سے کوئی برا یا غیر اخلاقی فعل سرزد ہو، اسے اس سے آگاہ کرے۔ بعض بزرگانِ دین فرمایا کرتے تھے: **''رحم اللہ امرء اھدی الی عیوبی''**، ''اللہ اس شخص پر رحم کرے جو میرے عیب مجھے تحفے میں دے۔'' لیکن ایسے افراد بھی بہت کم ہوتے ہیں، اس لئے کہ دوستوں کی اکثریت عیبوں کی پردہ پوشی کرتی ہے یا پھر بعض دوست ایسے بھی ہوتے ہیں جو حسد جیسے جذبات کی وجہ سے آپ کے عیوب کو بڑھا چڑھا کر آپ کے سامنے بیان کریں گے۔ داؤد بن نصیر طائی جو دوسری صدی ہجری کے عظیم عابد اور زاہد تھے، ان سے پوچھا گیا کہ آپ لوگوں سے کیوں دور رہتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: میں ایسے لوگوں کے نزدیک کیوں رہوں جو میرے گناہوں کو مجھ سے چھپاتے ہیں۔

دیندار افراد اس بات کو بہت زیادہ پسند کرتے ہیں کہ دوسروں کی نصیحت کی روشنی میں اپنے عیوب سے باخبر ہوں۔ لیکن آج کے دور میں حالات ایسے ہو چکے ہیں کہ اگر کوئی ہمیں ہمارے عیب سے باخبر کرے تو وہی ہماری نظر میں قابل نفرت بن جاتا ہے۔ ہم نہ صرف ان کی بات سننے کو تیار نہیں ہوتے بلکہ الٹا ان سے جھگڑا کرنے لگتے ہیں، اپنے دل میں ان کے بارے میں کینہ اور غصہ بھرنا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کا سب سے بڑا نقصان بھی ہم خود اٹھاتے ہیں کیونکہ اس طرح ہم ان کی نصیحتوں

سے محروم ہوجاتے ہیں۔

تیسرا راستہ یہ ہے کہ انسان اپنے عیب اپنے دشمن کی زبان سے سنے، اس لئے کہ انسان کا دشمن بڑی باریک بینی سے اس کی کوتاہیوں اور خامیوں پر نظر رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات انسان ایک سخت کینہ پرور دشمن سے ایسی باتیں سیکھ لیتا ہے جو خوشامد کرنے والے دوستوں سے نہیں سیکھ سکتا۔

چوتھا راستہ یہ ہے کہ انسان لوگوں میں رہے۔ ان کے افعال و اخلاق کا غور سے مطالعہ کرے اور جو ناپسندیدہ اور مذموم صفات ان میں دیکھے، ان کے حوالہ سے اپنا جائزہ لیتا رہے کہ کہیں وہ صفات خود اس میں تو موجود نہیں ہیں، اس لئے کہ مومن مومن کا آئینہ ہوتا ہے اور انسان اس کے عیوب کے آئینے میں اپنے عیوب کو تلاش کرسکتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کسی نے پوچھا کہ آپؑ کو یہ آداب کس نے سکھائے؟ انہوں نے جواب دیا: میں نے یہ آداب کسی سے نہیں سیکھے لیکن جب میں نے جاہل کے جہل کو دیکھا اور وہ مجھے ناپسندیدہ لگا تو میں نے اس سے اجتناب کیا۔ (یہ بات حضرت لقمان کے بارے میں اس طرح مشہور ہے کہ آپ نے کس سے آداب سیکھے تو انہوں نے جواب دیا: بے ادب افراد سے)۔ (محجۃ البیضاء ۵:۱۱۲)

عبادت اور دعا روح کو پروان چڑھاتی ہیں

تہذیب اخلاق کے لیے دوسرا قدم یہ ہے کہ عبادات اور دعا کی طرف توجہ کی جائے۔ عبادت اور دعا تہذیب نفس اور اخلاقی فضائل کو پروان چڑھانے میں کتنا موثر کردار ادا کرتی ہیں، یہ جاننے کے لیے ہر چیز سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم عبادت کی حقیقت کو سمجھیں۔

عبادت کی حقیقت کے بارے میں گفتگو اگرچہ بہت طولانی اور مفصل ہے مگر اختصار کے ساتھ اس کی طرف ان الفاظ سے اشارہ کیا جاسکتا ہے کہ عبادت کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے لفظ ''عبد'' کے مفہوم پر غور کیا جائے، اس لیے کہ ''عبادت''، ''عبد'' سے ماخوذ ہے۔

لغت کی رو سے ''عبد'' اس شخص کو کہتے ہیں جو سر سے پاؤں تک اپنے مالک اور آقا کی ملکیت ہوتا ہے۔ اس کا ارادہ آقا کے ارادے کے تابع اور اس کی ہر خواہش اس کے آقا کی خواہش کے تابع ہوتی ہے۔ اپنے مالک کے مقابلہ میں وہ اپنے آپ کو کسی چیز کا مالک نہیں سمجھتا اور اس کی اطاعت میں کسی قسم کی سستی روا نہیں رکھتا۔

اس لحاظ سے عبودیت کسی ایسی ذات کے سامنے خشوع و خضوع کے انتہائی درجے کا اظہار ہے جس سے انسان کا وجود اور اس کی ہر چیز وابستہ ہے۔ یہاں سے یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ کسی انسان کا معبود صرف وہ ہوسکتا ہے جس نے اس پر بے حد و حساب انعام و اکرام کیا ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی نہیں ہے۔

بالفاظِ دیگر ''عبودیت'' کسی انسان کی روح کے ارتقاء کا اعلیٰ ترین مرحلہ ہے۔ یہ انسان کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ قرب کا دوسرا

نام ہے۔''عبودیت'' اللہ تعالیٰ کی پاک ذات کے سامنے بے قید وشرط اور سو فیصد سپردگی کا نام ہے۔ بنابرایں، عبادت صرف رکوع و سجود اور قیام وقعود کا نام نہیں بلکہ یہ کمال مطلق اور ہر عیب ونقص سے پاک ذات کے سامنے مکمل طور پر سر تسلیم خم کر دینے کا نام ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ ایسا عمل کمالِ مطلق کی طرف توجہ کرنے اور ہر قسم کی ناپاکی وآلائش سے اجتناب کا بہترین محرک ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس عمل کے ذریعے انسان اپنے معبود کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تا کہ معبود کے جلال و جمال کا پرتو اس کے وجود میں منعکس ہو جائے اور وہ ''مظہر صفاتِ خدا'' بن جائے۔

ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

العبودیة جوهرة کنهها الربوبیة (مصباح الشریعہ بحوالہ میزان الحکمہ، مادہ: عبد)

''عبودیت ایک ایسا جوہر ہے جس کے باطن میں ربوبیت پوشیدہ ہے۔''

یہ حدیث اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ عبادت کے ذریعے عبد کوشش کرتا ہے کہ اس کے کردار اور صفات میں رب کی صفات جلال و جمال کا ظہور ہو۔ اس کے علاوہ عبد، عبودیت کے زیر سایہ ولایت تکوینیہ کے مقام تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ (ولایت تکوینیہ کے بارے میں علماء میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو ولایت تکوینیہ حاصل ہے یا نہیں۔ اگرچہ علماء کی ایک جماعت انبیاء، آئمہ اور اولیاء کے بعد ولایت تکوینیہ کی قائل ہے مگر بزرگ علماء کی اچھی خاصی تعداد ولایت تکوینیہ کو اللہ تعالیٰ سے مخصوص قرار دیتی ہے)۔

اس تمہید کے بعد ہم قرآن شریف کی روشنی میں اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ فضائل اخلاق کی پرورش میں عبادت کیا کردار ادا کرتی ہے۔

۱۔ يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾
(بقرہ: ۲۱)

''اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تا کہ تم متقی بن جاؤ۔''

۲۔ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تا کہ تم متقی بن جاؤ۔'' (بقرہ: ۱۸۳)

۳۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ

''اور نماز قائم کرو، بے شک نماز بدکاری اور گناہ سے روکتی ہے۔'' (عنکبوت:۴۵)

۴۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿١٩﴾ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ﴿٢٠﴾ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ﴿٢١﴾ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ﴿٢٢﴾ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴿٢٣﴾

''یقینا انسان حریص اور کم ہمت پیدا کیا گیا ہے۔ جب کوئی برائی اسے پہنچتی ہے تو بیتابی کرتا ہے اور جب کوئی خیر اور بھلائی اسے پہنچتی ہے تو دوسروں کو اس سے روکتا ہے، سوائے نماز گزاروں کے جو اپنی نمازوں کو دوام بخشتے ہیں۔'' (معارج:۱۹ تا ۲۳)

۵۔ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (توبہ:۱۰۳)

''ان کے اموال سے صدقہ وصول کرو اور اس کے ذریعے انہیں پاک کرو اور ان کا تزکیہ کرو۔''

۶۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۗ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴿٢٨﴾

''وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کی یاد سے اطمینان پاتے ہیں اور آگاہ رہو کہ اللہ کی یاد سے ہی دلوں کو اطمینان ملتا ہے۔'' (رعد:۲۸)

۷۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٥٣﴾

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! نماز اور صبر کے ذریعے مدد طلب کرو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' (بقرہ:۱۵۳)

تفسیر اور نتیجہ

مندرجہ بالا آیات میں عبادت کا تقویٰ، گناہوں سے پرہیز اور فضائل اخلاقی کی پرورش کے ساتھ قریبی تعلق نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ ان آیات سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ جو لوگ تہذیب نفس کی دولت حاصل کرنا چاہتے ہیں، انہیں اللہ تعالی کی بندگی اور اطاعت کا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ سالکانِ راہِ خدا اور تقویٰ و خودسازی کی منزل کے مسافروں پر لازم ہے کہ وہ عبادت اور دعا کے ذریعے مدد مانگیں اور اپنے وجود کی آلائشات کو عشق خدا کی بھٹی میں جلا کر ان سے چھٹکارا حاصل کریں اور اس طرح اپنے وجود کے تانبے کو کیمیائے عبادت کے ذریعے سونا بنالیں۔

اس سلسلہ میں مندرجہ بالا آیات میں سے پہلی آیت بغیر کسی استثناء کے تمام انسانوں کو مخاطب کر کے انہیں یہ کہہ رہی ہے:

''اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تا کہ تم متقی بن جاؤ۔''

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾

(بقرہ:۲۱)

اس آیت میں گزشتہ لوگوں کی غفلت کی طرف اشارہ کرنے سے شاید یہ مقصود ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عرب اپنی بت پرستی کا جواز یہ بتاتے تھے کہ ان کی گزشتہ نسلیں بت پرستی اور شرک کی راہ پر چل رہی تھیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہ فرمار ہا ہے کہ تمہارا اور تم سے پہلے سب لوگوں کا خالق اللہ ہی ہے، وہ ہر ایک اور ہر چیز کا خالق و مالک ہے اور صرف وہی عبادت کے لائق ہے۔ بت کسی طور پر بھی پرستش کے لائق نہیں ہیں۔ اگر تم اخلاص کے ساتھ اس کی بندگی و عبادت کرو گے تو تمہارے وجود کی شاخوں پر تقویٰ کے پھول کھلیں گے۔ تمہاری موجودہ غیر اخلاقی صورتحال کی وجہ تمہاری جاہلانہ عبادات ہیں۔

یہ آیت عبادت اور تقویٰ کے تعلق کو غیر مشروط طور پر بیان کرتی ہے۔

دوسری آیت میں روزہ اور تقویٰ کے باہمی ربط و تعلق کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرمار ہا ہے:

''اے اہل ایمان! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تا کہ تم متقی بن جاؤ۔''

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾

ہر انسان اس بات کو بخوبی درک کرسکتا ہے کہ جب وہ روزہ کی حالت میں ہوتا ہے تو ایک خاص نورانیت اور پاکیزگی اپنے دل میں محسوس کرتا ہے وہ اپنے آپ کو نیکی کے قریب تر اور برائیوں سے دور محسوس کرتا ہے۔ اعداد و شمار سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ماہِ مبارک رمضان میں معاشرے میں جرائم کی سطح نیچے آجاتی ہے۔ اس سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ انسان جس قدر اللہ کی بندگی کے نزدیک ہوتا ہے، اتنا ہی برائیوں سے دور ہوتا ہے۔

تیسری آیت میں نماز اور فحش حرکات و منکرات سے دوری کا باہمی تعلق نظر آتا ہے۔ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے:

''نماز قائم کرو، یقیناً نماز (انسان کو) برائی اور گناہ سے باز رکھتی ہے۔''

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ

اس آیت میں ''فحشاء و منکرات'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو تمام غیر اخلاقی افعال کے مجموعہ پر منطبق ہوتے ہیں۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ تمام غیر اخلاقی افعال کا سرچشمہ وہ غیر اخلاقی اقدار ہوتی ہیں جو انسان کے اندر پائی جاتی ہیں۔

بالفاظ دیگر یہ اندرونی اخلاق ہے جو ظاہری اخلاق پر اثر انداز ہوتا ہے۔

نماز فحشاء و منکرات سے اس لئے روکتی ہے کہ نماز کے با معنی اذکار و اعمال کی بدولت انسان قرب خدا کی روحانی دنیا میں داخل ہوجاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ گناہ کے محرکات یعنی ہوائے نفس اور حب دنیا سے دور ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پابند نماز افراد کی زندگی میں گناہ کم نظر آتا ہے۔ جس قدر نماز زیادہ معنویت کے ساتھ ادا کی جائے، اسی تناسب سے انسان برائی اور بدکاری سے دور ہوجاتا ہے اور اسی قدر انسان کے اندر اخلاقی صفات واضح اور آشکار ہوجاتی ہیں۔

چوتھی آیت میں صرف نمازیوں کو بعض اخلاقی رذائل مثلاً مشکلات میں بے صبری، حصول دولت کے بعد بخل وغیرہ سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"انسان حریص اور کم ہمت پیدا ہوا ہے، جب کوئی برائی اس پر آتی ہے تو وہ بے صبری کرنے لگتا ہے، جب اسے کوئی بھلائی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے اور دوسروں کا حق روکتا ہے، سوائے ان نمازیوں کے جو باقاعدگی سے نماز ادا کرتے ہیں۔"

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿١٩﴾ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ﴿٢٠﴾ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ﴿٢١﴾ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ﴿٢٢﴾ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴿٢٣﴾ (معارج:۱۹ تا ۲۳)

یہ آیت اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کر دیتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کی طرف توجہ، عبادت اور دعا، انسان کے باطن سے بخل، بے صبری اور دیگر اخلاقی برائیوں کے خاتمہ پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہیں۔

پانچویں آیت میں زکوٰۃ اور روح کی پاکیزگی و تزکیہ نفس کے باہمی تعلق کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ بات کسی پر پوشیدہ نہیں ہے کہ زکوٰۃ ایک اہم عبادت ہے۔ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے:

"ان کے اموال سے صدقہ یعنی زکوٰۃ وصول کرو تا کہ تم اس کے ذریعے ان کو پاک کرو اور ان کا تزکیہ نفس کرو۔"

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (توبہ:۱۰۳)

"تزکیھم بھا" کے الفاظ واضح طور پر اس بات پر روشنی ڈالتے ہیں کہ زکوٰۃ کے ذریعے تزکیہ نفس حاصل ہوتا ہے، اس لئے کہ زکوٰۃ کے ذریعے انسان بخل، حرص، دنیا پرستی اور حب مال جیسے رذائل سے پاک ہوجاتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کے ذریعے انسان دوستی، سخاوت اور غریبوں سے ہمدردی جیسی اخلاقی صفات انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہیں۔

اس آیت کے ذیل میں جو احادیث نقل ہوئی ہیں، وہ بھی اسی حقیقت کو بیان کرتی ہیں۔ رسولؐ اللہ ایک حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں:

ما تصدق احد کم بصدقۃ من طیب۔ و لا یقبل اللہ الا اخذھا الرحمان بیمینہ و ان کانت تمرۃ فتربو من کف الرحمان فی الرحمان حتی تکون اعظم من الجبل

''تم میں سے جو کوئی مالِ حلال سے صدقہ دیتا ہے، اللہ تعالیٰ سوائے مال حلال کے قبول نہیں فرماتا۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنے ہاتھ سے وصول فرماتا ہے، خواہ وہ کھجور کا ایک دانہ ہو۔ پھر وہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ پہاڑ سے بھی بڑا ہو جاتا ہے۔'' (صحیح مسلم، ۲:۱۰۲، مطبوعہ بیروت)

یہ حدیث انتہائی بامعنی تشبیہ اور کنایہ پر مشتمل ہے اور زکوٰۃ ایسی عظیم عبادت کی اہمیت اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے براہِ راست تعلق کو واضح کرتی ہے۔

چھٹی آیت میں ایک اور اہم عبادت یعنی اللہ کے ذکر کی اس خصوصیت کو بیان کیا گیا ہے کہ یہ اطمینانِ قلب کا ذریعہ ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کے ذکر کے ذریعے اطمینان پاتے ہیں اور آگاہ رہو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔'' (رعد:۲۸)

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ۝۲۸

اطمینان قلب ہمیشہ اللہ پر توکل، مادیات سے عدم تعلق اور دنیوی زیب و زینت، طمع، بخل اور حسد جیسی صفاتِ رذیلہ سے دوری میں مضمر ہے۔ اگر یہ صفات انسان کے دل میں موجود ہوں تو انسان کبھی اطمینانِ قلب حاصل نہیں کر سکتا۔ اللہ کا ذکر ان صفاتِ رذیلہ کو انسان کے دل سے دور کرنے میں گہرا اثر رکھتا ہے تاکہ انسان کا دل سکون کی دولت حاصل کر سکے۔

بالفاظ دیگر اگر ہم انسان کے دل میں موجود بے سکونی و اضطراب پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان کی اصل وجہ قلب میں موجود اخلاقی رذائل ہیں۔ اللہ کا ذکر اخلاقی رذائل کی جڑوں کو جلا کر خاکستر کر دیتا ہے اور بے اطمینانی کو اطمینان میں بدل دیتا ہے [1]۔

ساتویں آیت میں انسان کی روحانی قوت کے لیے نماز اور روزہ کے اثر کو بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! نماز اور صبر (روزہ) کے ذریعے مدد طلب کرو، اس لئے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' (بقرہ:۱۵۳)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۵۳

بعض احادیث میں آیا ہے کہ اس آیت میں صبر سے مراد روزہ ہے۔ یہ درحقیقت صبر کے ایک مصداق کا ذکر ہے ورنہ صبر کا

---

[1] مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ میں اس آیت کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں جہاں اس کی مفصل تشریح کی گئی ہے۔

مفہوم بہت وسیع ہے جس میں ہوائے نفس اور شیطانی وسوسوں کے خلاف ہر قسم کی مزاحمت، اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت میں استقامت اور ناخوشگوار حوادث کے سامنے ثابت قدمی بھی شامل ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام کو جب بھی کوئی مشکل پیش آتی تو آپؑ نماز پڑھتے اور اس کے بعد آیہ شریفہ "واستعینوا بالصبر و الصلوۃ" کی تلاوت فرماتے۔

كان علی اذا احاله امر فزع قام الى الصلوة ثم تلاهذه الآية واستعينوا بالصبر و الصلوة (اصول کافی بحوالہ المیزان،ا:۱۵۴)

یہ حدیث بھی اس حقیقت کو واضح کر دیتی ہے کہ نماز انسان کو قوت بخشتی ہے۔

درحقیقت یہ عبادات انسان کے اندر توکل، شجاعت، ہمت اور صبر و استقامت جیسے فضائل پیدا کرتی ہیں اور خوف، بزدلی، تذبذب، بے چینی اور دنیا پرستی جیسے رذائل اخلاقی سے انسان کے دل کو پاک کر دیتی ہیں۔ اس طرح انسان کے دل میں بہت سے اخلاقی فضائل زندہ ہوجاتے ہیں اور بہت سے اخلاقی رذائل کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔

نتیجہ

مذکورہ بالا بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ عبادات مختلف پہلوؤں سے تہذیب اخلاق پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس تاثیر کے مختلف پہلوؤں کو مختصراً اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ اگر انسان اپنی زندگی میں خالق کائنات کی طرف توجہ رکھے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اعمال و افعال کے بارے میں محتاط ہوجاتا ہے اور جہاں تک ممکن ہو، اپنی خواہشاتِ نفس کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتا ہے، اس لئے کہ دنیا اللہ کی سلطنت ہے اور اللہ کی سلطنت میں اللہ کی نافرمانی بدترین ناشکری ہے۔

۲۔ عبادات خصوصاً دعاؤں میں اللہ تعالیٰ کی جو صفاتِ جلال و جمال بیان ہوئی ہیں، ان کا ذکر دعا کرنے والے کے دل میں یہ خواہش پیدا کرتا ہے کہ ان صفات کا پرتو اس کے اندر منعکس ہوجائے اور وہ اخلاقی ترقی کی راہ پر پیشرفت کرنے لگتا ہے۔

۳۔ آخرت اور اللہ تعالیٰ کی عظیم اور پرجلال عدالت کی طرف توجہ بھی انسان کی روح و جسم کی پاکیزگی پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔

۴۔ اگر عبادات اور دعا قلبی توجہ اور آداب کے ہمراہ ہو تو انسان کے باطن میں ناقابل بیان نورانیت اور پاکیزگی پیدا ہوجاتی ہے جس کے سامنے رذائل اخلاقی کی قوت ٹوٹ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک لحظہ کے لیے حضورِ قلب کے ساتھ انجام دی گئی عبادت اور دعا کے بعد انسان اپنے آپ کو نیکیوں کے بہت قریب محسوس کرتا ہے۔

۵۔ عبادات اور دعاؤں کے معنی اخلاقی تعلیمات اور سیر و سلوک الی اللہ کے اسرار و رموز سے سرشار ہوتے ہیں۔ اگر انسان ان میں غور و فکر کرے تو اسے عظیم درس ملتے ہیں۔ خودسازی کے عاشق اور سالکانِ الی اللہ عبادات کے ذریعے اپنے اعلیٰ مقصد تک رسائی

حاصل کر سکتے ہیں۔عبادات، مناجات اور دعاؤں کے بغیر خاص طور پر عبادت اور ذکر وفکر سحر کے بغیر کوئی شخص کسی روحانی مقصد کو حاصل نہیں کر سکتا۔

پاکیزگی روح میں عبادات کا کردار احادیث کی روشنی میں

احادیث میں بھی اس مسئلہ پر بہت زیادہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ان تمام کا ذکر کرنے کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔لہٰذا ہم ان کی طرف مختصر اشارہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

۱۔ وہ تمام احادیث جن میں فلسفہ احکام کو بیان کیا گیا ہے، ان سب میں دل کی پاکیزگی اور روحانی طہارت کے حصول میں عبادات کے کردار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

فرض الله الايمان تطهيرا من الشرك، و الصلوة تنزيها عن الكبر والزكاة تسبيبا للرزق، والصيام ابتلاء لاخلاص الخلق

''اللہ تعالیٰ نے ایمان کو، دلوں کو شرک سے پاک کرنے ،نماز کو تکبر سے دوری کے لیے، زکوٰۃ کو وسعت رزق کے لیے اور روزہ کو بندوں میں اخلاص پیدا کرنے کے لیے فرض کیا۔''

(نہج البلاغہ، کلمات قصار: ۲۵۲)

۲۔ رسولؐ اللہ کی ایک مشہور حدیث میں نماز کو صاف وشفاف پانی کی نہر سے تشبیہ دی گئی ہے جو انسان کے گھر کے سامنے بہہ رہی ہو اور انسان ہر روز پانچ مرتبہ اس میں نہاتا ہو۔ظاہری بات ہے کہ ایسے شخص پر کسی قسم کی گندگی باقی نہیں رہ سکتی۔

اسی طرح احادیث میں ہر عبادت کے آثار ونتائج کا ذکر کیا گیا ہے جو تہذیب نفس پر عبادت کے اثرات کو بیان کرتی ہیں۔

۳۔ ایک اور حدیث میں حضرت امام علی رضا علیہ السلام عبادت کے آثار کے بارے میں فرماتے ہیں:

فان قال فلم تعبدهم؟ قيل لئلا يكونوا ناسين لذكره ولا تاركين لادبه ولا لاهين عن امره و نهيه، اذا كان فيه صلاحهم و قوامهم، فلو تركوا بغير تعبد، لطال عليهم الامد فقست قلوبهم

''اگر کوئی یہ کہے کہ اللہ نے بندوں کو کیوں عبادت کا حکم دیا ہے؟ (یعنی ان کی عبادت کی اسے کیا ضرورت ہے؟) ان کے جواب میں کہا جائے گا کہ اللہ نے اس لیے عبادت کا حکم دیا تا کہ لوگ اس کی یاد کو بھلا نہ دیں، اس کی بارگاہ کے ادب واحترام سے غافل نہ ہو جائیں۔اس کے اوامر ونواہی کو نظر

اندازنہ کریں، اس لئے کہ اسی میں ان کی بہتری ہے۔ اگر لوگ عبادت کے بغیر چھوڑ دیئے جاتے تو ان پر غفلت کے طویل دورانیے آ جاتے اوران کے دل سخت ہوجاتے۔''

(عیوان الاخبار الرضاؑ بحوالہ نور الثقلین، ۱:۳۹)

۴۔ ایک اور حدیث میں امام رضا علیہ السلام نماز کے آثار بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

مع مافیه من الایجاب والمداومة علی ذکر الله عزوجل باللیل و النهار لئلا ینسی العبد سیده و مدبره و خالقه، فیبطر و یطغی ویکون فی ذکره لربه و قیامه بین یدیه زاجرا له عن المعاصی و مانعاله عن انواع الفساد

''عبادت کے سبب بندہ شب و روز اللہ تعالیٰ کا باقاعدگی سے ذکر کرتا ہے تاکہ وہ اپنے آقا، مدبر اور خالق کوفراموش نہ کردے اور غرور وسرکشی میں گرفتار نہ ہوجائے۔ اللہ کا ذکر اوراس کی بارگاہ میں کھڑے ہونا انسان کو گناہوں سے روکتا ہے اور مختلف قسم کی خرابیوں سے بچاتا ہے۔'' (وسائل الشیعہ، ۳:۴)

۵۔ ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نماز کے نتائج اور اس کی قبولیت کے پیمانہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

من احب ان یعلم ان قبلت صلاته ام لم تقبل فلینظر هل منعت صلاته عن الفضشاء و المنکر، فبقدر مامنعته قبلت

''جو شخص یہ جاننا چاہتا ہو کہ اس کی نماز قبول ہوئی ہے یا نہیں تو وہ یہ دیکھے کہ اس کی نماز اسے بدکاری اور گناہ سے روکتی ہے یا نہیں؟ جس قدر اس کی نماز اسے بدکاری اور گناہ سے روکتی ہے، اتنی ہی وہ قبول ہوئی ہے۔'' (مجمع البیان، ۸:۲۵۸)

یہ حدیث اس بات کو نہایت واضح طور پر بیان کررہی ہے کہ صحیح نماز کا اخلاقی ارتقاء، برائیوں سے روکنے اور نیکیوں کی انجام دہی کے ساتھ براہِ راست اور قریبی تعلق ہے۔ جن کی نماز میں یہ اثر نہیں ہے، ان کی نماز ایک بے جان نماز کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ ایسی نماز سے ادائے فرض کی خانہ پری تو ہوجاتی ہے مگر وہ اللہ کی بارگاہ میں قبول نہیں ہوتی۔

۶۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں روزے کا فلسفہ اس طرح بیان ہوا ہے:

ان الصوم یمیت مراد النفس و شهوة الطبع الحیوانی، وفیه صفاء القلب و طهارة الجوارح و عمارة الظاهر و الباطن، والشکر علی النعم والاحسان الی

الفقراء، و زيادة التضرع والخشوع، والبكاء و جعل الالتجاء الى الله، و سبب انكسار الهمة، و تخفيف السيئات، وتضعيف الحسنات، و فيه من الفوائد مالا يحصى (بحارالانوار، ۹۳: ۲۵۴)

''روزہ ہوائے نفسانی اور خواہشاتِ حیوانی کو مار دیتا ہے۔ یہ قلب کی پاکیزگی اور اعضاء کی طہارت کا سامان فراہم کرتا ہے۔ انسان کے ظاہر و باطن کی آبادی کا سبب ہوتا ہے اور نعمتوں کا شکر ادا کرنے، فقراء کے ساتھ نیکی و احسان، تضرع اور عاجزی، اللہ کی بارگاہ میں گریہ و التماس کا محرک ہوتا ہے۔ یہ ہمت گناہ کو توڑتا ہے، گناہوں کو کم کرتا ہے، نیکیوں میں اضافہ کرتا ہے اور اس کے فوائد کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔''

اس حدیث میں روزے کے چودہ مثبت اثرات کا ذکر کیا گیا ہے جو اخلاقی فضائل و اعمال کا ایک مجموعہ ہے۔

۷۔ ہم اس مفصل بحث کا خاتمہ امیر المومنین علیہ السلام کی ایک حدیث پر کرتے ہیں (جو لوگ تفصیل کے خواہشمند ہوں، وہ وسائل الشیعہ اور بحارالانوار میں ہر عبارت کے شروع میں اس کی فضیلت کی احادیث کی طرف رجوع فرمائیں)۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

دوام العبادة برهان الظفر بالسعادة

''عبادت میں باقاعدگی اور استمرار سعادت تک پہنچنے کا ثبوت ہے۔'' (غرر الحکم: ۷۔ ۵۱۴)

بلاشبہ جو لوگ سعادت کے طالب ہیں، انہیں اللہ کی عبادت، دعا اور مناجات کا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔

نتیجہ

مندرجہ بالا احادیث عبادت اور پاکیزگی قلب و تہذیب نفس کے قریبی تعلق پر روشنی ڈالتی ہیں، خصوصاً عبادت جس قدر اخلاص اور حضورِ قلب پایا جائے، اس کا یہ اثر اتنا ہی قوی ہوتا ہے۔

اس بات کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے کہ جب انسان اخلاص اور حضورِ قلب سے عبادت کرتا ہے تو اس کے بعد اپنے قلب و روح میں ایک خاص پاکیزگی اور نورانیت محسوس کرتا ہے۔ اس کے اندر نیکی کا رجحان بڑھ جاتا ہے اور اس کی طبیعت گناہ اور برائی سے متنفر ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اللہ کے قریب محسوس کرتا ہے۔ اس کے اندر بندگی اور تسلیم و رضا کا جذبہ بھی قوی ہو جاتا ہے۔

یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ ایک نتیجہ تمام عبادات میں مشترک ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کے حضور خشوع و خضوع اور اس کے لیے اخلاص و تسلیم، یادِ الٰہی کا دل میں زندہ رہنا اور غفلت کا خاتمہ، اس کے علاوہ ہر عبادت کے اپنے مخصوص نتائج و اثرات بھی

انسان کی روح پر مرتب ہوتے ہیں۔

ان کے مخصوص نتائج ان عبادات کے ساتھ ایک خاص ربط اور تعلق رکھتے ہیں۔نماز فحشاء ومنکرات سے روکتی ہے۔روزہ قوتِ ارادی کو مضبوط کرتا ہے اور خواہشاتِ نفسانی کو عقل کے قابو میں دیتا ہے۔حج انسان کو دنیا کی چکا چوند سے آزاد کرتا ہے اور زکوۃ بخل اور حرص سے نجات دیتی ہے۔

ذکرِ خدا اطمینان قلب کا باعث ہوتا ہے۔ہر ذکر انسان کو اللہ کی کسی صفتِ جلال و جمال کی طرف متوجہ کرتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا عکس اپنے اندر پیدا کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

اس طرح جو شخص ان تمام عبادات کو انجام دیتا ہے، وہ ان کے مشترک اور عام اثر کے علاوہ ان کے مخصوص اثرات سے بھی فیضیاب ہوتا ہے اور ان کی مدد سے اپنے اندر اخلاقی فضائل کو پروان چڑھا سکتا ہے۔بنابرایں ہماری عبادت اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں دعا اور مناجات، خودسازی کا ایک موثر قدم ہوتی ہیں، بشرطیکہ ہم ان عبادات کی روح اور ان کی حکمتوں سے آگاہی رکھتے ہوں اور صرف ان کے ظاہری پہلو پر اکتفا نہ کریں۔ذکر خدا کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر ہم مستقل عنوان کے تحت اس پر بحث کریں گے۔

اللہ کا ذکر اور پرورش روح

قرآن مجید اور احادیث شریفہ کی روشنی میں علمائے اخلاق روح کی پاکیزگی اور تہذیب نفس کے معاملہ میں ذکر اللہ کی غیر معمولی اہمیت کے قائل ہوئے ہیں۔اسی وجہ سے انہوں نے سیر وسلوک کے تمام مراحل کے لیے مختلف اذکار کا ذکر کیا ہے، مثلاً مرحلہ توبہ میں ''یا غفار''، مرحلہ محاسبہ میں ''یا حسیب'' اور حصول رحمت الٰہی کے لیے ''یا رحمن'' اور ''یا رحیم'' کا ذکر تجویز کیا ہے۔

یہ اذکار مخصوص حالات اور سیر وسلوک کے مراحل کے علاوہ بھی، ذکر اللہ کی حیثیت سے ہر حال میں اچھے اور مفید ہیں۔اللہ کا ذکر بلاشبہ بہت بڑی عبادت ہے جو نفس اور شیطان کے وسوسوں کے مقابلہ میں انسان کی حفاظت کرتا ہے۔

خود پسندی اور غرور انسان کی سعادت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔اللہ کا ذکر ان رکاوٹوں کو برطرف کرتا ہے۔ انسان کو خواب غفلت سے بیدار کرتا ہے اور اسے ان خطرات سے آگاہ کرتا ہے جو اس کی سعادت کو لاحق ہو سکتے ہیں۔

اللہ کا ذکر بارش کے حیات افروز قطروں کی مانند انسان کے قلب و روح کی سرزمین کو فضیلت و تقویٰ کے گلستان میں تبدیل کر دیتا ہے۔اس عبادت کی اہمیت کے بارے میں جتنا بھی کہا جائے، کم ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم قرآن مجید کی روشنی میں اللہ کے ذکر کی اہمیت کا جائزہ لیتے ہیں:

۱۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ۝۲۸

''(اہل بیتؑ) وہ ہیں جو ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ آگاہ رہو کہ دلوں کو اللہ کے ذکر سے ہی اطمینان ملتا ہے۔'' (رعد:۲۸)

۲۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ (عنکبوت:۴۵)

''اور نماز قائم کرو، بے شک نماز فحشاء اور منکرات سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے۔''

۳۔ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ⑭ (طٰہٰ:۱۴)

''بلاشبہ میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری عبادت کر اور میرے ذکر کے لیے نماز قائم کر۔''

۴۔ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ۚ ⑫

''تم اور تمہارا بھائی میری آیات کے ساتھ جاؤ اور میری یاد کے بارے میں کوتاہی نہ کرو۔'' (طٰہٰ:۴۲)

۵۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا

''اور جو میری یاد سے روگردانی کرے گا، اس کی زندگی تنگ ہو جائے گی۔'' (طٰہٰ:۱۲۴)

۶۔ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ㉘

''اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ رکھو جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں، صرف اس کی توجہ و عنایت کے طالب ہوتے ہیں۔ تم دنیوی زندگی کی زیب و زینت کے لیے ان سے نظریں نہ پھیرو اور اس شخص کی اتباع نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا اور وہ اپنی خواہشات کی پیروی میں لگ گیا اور حد سے بڑھ گیا۔'' (کہف:۲۸)

۷۔ فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ㉙ (نجم:۲۹)

''جو ہماری یاد سے منہ موڑے ہوئے ہے اور دنیوی زندگی کے سوا کچھ نہیں چاہتا، اس سے منہ پھیر لو۔''

۸۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ㊶ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ㊷ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ㊸ (احزاب:۴۱ تا ۴۳)

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کو کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو۔ وہی جو تم پر

رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تمہارے لئے رحمت کی دعا کرتے ہیں تا کہ وہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر نور میں لے آئے اور وہ مومنین پر رحیم ہے۔''

۹۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ (مائدہ:۹۱)

''شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان نفرت اور دشمنی پیدا کرے اور تمہیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روکے۔''

۱۰۔ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (نور:۳۷)

''ایسے مرد جنہیں تجارت اور خرید وفروش اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتے۔''

تفسیر ونتیجہ

پہلی آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کی یاد کا یہ اثر ہوتا ہے کہ انسان کے دل کو اس سے اطمینان ملتا ہے۔ اس سے مراد وہ اطمینان ہوتا ہے جو انسان کو لغزشوں اور خطاؤں سے آزادی دلائے اور اسے اخلاقی فضائل سے آراستہ کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہدایت یافتہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور اللہ کے ذکر کی بدولت ان کے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ

اس کے بعد عام ضابطہ بیان کر دیا گیا کہ صرف اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾

اس غیر معمولی اطمینان کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی پریشانی یا اضطراب کا سبب مبہم مستقبل ہوتا ہے یا تلخ ماضی۔ بالفاظ دیگر مستقبل میں رونما ہونے والے نامعلوم حوادث کا خوف یا ماضی میں رونما ہونے والے حوادث کی تلخ یادیں انسان کا آرام واطمینان تباہ کر دیتی ہیں اور انہی کے سائے بھوت بن کر انسان کے ذہن پر چھائے رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ جو نہ صرف تمام انسانوں بلکہ ساری کائنات کا سخی وکریم، رحمن ورحیم اور خالق ورازق رب ہے، جو ہر مشکل کو آسان کرنے کی پوری پوری قدرت رکھتا ہے اور پیچیدہ ترین مشکلات اس کے ارادے کے سامنے بالکل سادہ ہیں، اس رحمن ورحیم رب کا ذکر اور اس کی یاد انسان کو ان تمام پریشانیوں اور اضطرابات سے نجات دیتی ہے۔ انسان کے اندر اخلاقی فضائل کی پرورش کی راہ ہموار کرتی ہے۔ جب انسان اللہ کی یاد کے ذریعے اطمینان کی دولت حاصل کر لیتا ہے تو وہ اس آیت کا مصداق بن جاتا ہے:

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿۲۸﴾ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿۲۹﴾

وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (فجر:۲۷ تا ۳۰)

''اے نفس مطمئنہ! اپنے رب کی طرف واپس آ جا، تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے، پس میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔''

دوسری آیت میں پہلے یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ نماز انسان کو فحشاء اور منکرات سے روکتی ہے۔ اس کے بعد کہا گیا: "ولذکر اللہ اکبر"، یعنی ''اللہ کا ذکر سب سے بڑی بات ہے۔''

بلاشبہ اللہ کا ذکر نماز کی روح ہے جبکہ روح کسی چیز کا اشرف ترین جزو ہوتا ہے۔ اگر نماز فحشاء و منکرات سے روکتی ہے تو اس کی وجہ اللہ کا ذکر ہی ہے، اس لئے کہ اللہ کا ذکر انسان کو اللہ کی نعمتوں کی طرف متوجہ کرتا ہے اور نعمتوں کی یاد انسان کو ان نعمتوں کے بخشنے والے کی نافرمانی سے روکتی ہے اور وہ اپنے گناہوں پر شرمندہ ہوتا ہے۔

اسی طرح اللہ کا ذکر انسان کو قیامت اور اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان اور پرجلال عدالت کی یاد دلاتا ہے، انسان کو ملائکہ عذاب اور ملائکہ رحمت کی یاد دلاتا ہے جو بدکاروں کو سزا دینے اور نیکوکاروں کی پذیرائی اور استقبال پر مامور کئے جائیں گے۔ یہ چیز بھی انسان کو گناہ سے باز رکھنے میں موثر کردار ادا کرتی ہے۔

بعض مفسرین نے "ولذکر اللہ اکبر" کے ایک اور معنی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، وہ یہ کہ اس جملے کی رو سے ''اللہ کا ذکر سب سے بڑی عبادت ہے۔''

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ ''ذکراللہ'' سے مراد وہ ذکر ہے جو اللہ اپنے بندے کا کرتا ہے۔ یعنی جب بندہ اللہ کا ذکر کرتا ہے تو جواباً اللہ تعالیٰ بھی اس کا ذکر کرتا ہوے۔ (محجۃ البیضاء، ۲:۲۶۶)

اللہ کا یہ ذکر انسان کو عبودیت اور بندگی کے اعلیٰ درجات کی طرف مائل اور راغب کرتا ہے اور یہ ذکر ہر چیز سے افضل اور برتر ہوتا ہے۔ لیکن پہلے معنی اور آیت کے درمیان زیادہ مناسبت پائی جاتی ہے۔

تیسری آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ہونے والی وحی کا ذکر ہے جس میں انہوں نے سرزمین طور پر ایک درخت کے قریب اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام سنا:

''میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، میری عبادت کر اور میرے ذکر کے لیے نماز قائم کر۔''

اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴿۱۴﴾

اس آیت میں اللہ کی یاد کو نماز کا اصل مقصد قرار دیا گیا ہے۔ پہلی وحی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ کیا گیا ہے جس سے اللہ کے ذکر کی غیر معمولی اہمیت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ توحید کے ذکر کے فوراً بعد اللہ کے ذکر اور نماز کا ذکر کرنا اس کی اہمیت کو مزید اجاگر کر دیتا ہے۔

چوتھی آیت میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی حضرت ہارون سے خطاب کیا گیا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ

السلام کومبعوث کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ تم اور تمہارا بھائی فرعون کی طرف جاؤ اور میرے ذکر کے بارے میں کوتاہی نہ کرو:

اِذۡهَبۡ اَنۡتَ وَاَخُوۡكَ بِاٰيٰتِىۡ وَلَا تَنِيَا فِىۡ ذِكۡرِىۡ ۝۴۲

اللہ کے ذکر کا حکم اور وہ بھی فرعون جیسے جابر وسرکش کے خلاف، جنگ کے وقت، بہت پر معنی ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا ذکر انسان کو باطل کے خلاف جنگ میں کس قدر قوت، طاقت اور شجاعت عطا کرتا ہے۔

تفسیر فی ظلال میں اس آیت کی تشریح میں کہا گیا ہے:

''اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون سے کہا کہ میرا ذکر تمہارا ہتھیار اور اسلحہ ہے اور ایسا سہارا ہے جس پر تم بھروسہ کر سکتے ہو۔'' (فی ظلال القرآن، ۵: ۴۷۴)

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت میں ذکر سے مراد پیامِ رسالت کی تبلیغ ہے جبکہ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد اللہ کی یاد ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان تشریحات کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔

ظاہری بات ہے کہ جب اللہ کا رسولؐ، اللہ کے ذکر میں مشغول ہو اور اس سے روحانی طاقت حاصل کر رہا ہو تو اللہ کے پیغام کی تبلیغ زیادہ موثر طور پر کر سکے گا۔

پانچویں آیت میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کو ترک کرنے کے بعض آثار و نتائج کا ذکر کیا گیا ہے۔اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''جو کوئی میری یاد سے روگردانی کرے گا، اس کی زندگی سخت اور تنگ ہو جائے گی اور قیامت کے دن ہم اسے نابینا محشور کریں گے۔''

وَمَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِكۡرِىۡ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيۡشَةً ضَنۡكًا وَّنَحۡشُرُهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اَعۡمٰى ۝۱۲۴

ان لوگوں کی دنیوی سزا تنگ اور سخت زندگی اور اخروی سزا یہ ہے کہ وہ اندھے محشور ہوں گے۔

زندگی کی تنگی بعض اوقات اقتصادی مشکلات کی صورت میں ہوتی ہے اور بعض اوقات مال و دولت کی فراوانی کے باوجود بخل، حرص اور طمع کی وجہ سے ہوتی ہے۔ایسا انسان کبھی اس بات کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ اس کے گھر کے دروازے کھلے ہوں اور لوگ اس کی زندگی اور اس کے مال و دولت سے استفادہ کریں۔ایسا شخص فقراء اور مساکین کو ان نعمتوں میں شریک کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کر رکھی ہیں۔حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ دولت مند بخیل دنیا میں فقراء جیسی زندگی بسر کرتے ہیں اور آخرت میں حساب دولت مندوں کی طرح دیں گے۔ (بحارالانوار، ۶۹: ۱۱۹)

يعيش فی الدنيا عيش الفقراء ويحاسب فی الآخرة حساب الأغنياء

اللہ کی یاد سے غافل دولت مندوں کی اکثریت کا یہی حال ہوتا ہے۔ان کا بخل اور ان کی طمع ہر وقت ایک آگ بن کر ان کی زندگی کو سلگاتی رہتی ہے۔مال و دولت کی فراوانی کے باوجود انہیں آرام واطمینان نصیب نہیں ہوتا۔

آخرت میں اندھا محشور ہونے کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس دنیا کے حقائق اور اس دنیا کے حقائق کے درمیان مکمل ہم آہنگی پائی جاتی

ہے۔ اللہ کے ذکر سے منہ موڑنے والے ان حقائق کو اور آیات حق کو دیکھنے سے اندھے ہو جاتے ہیں جو اس دنیا میں ہر طرف موجود ہیں۔ لہٰذا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اندھے پیش کئے جائیں گے۔

چھٹی آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا جا رہا ہے کہ ان لوگوں کی پیروی سے اجتناب کریں جن کے دل اللہ کی یاد سے غافل ہیں اور ان لوگوں کے ساتھ رہیں جو صبح و شام اللہ کے ذکر میں مشغول رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

> ''ان لوگوں کے ساتھ رہو جو صبح و شام اللہ کو پکارتے ہیں اور صرف اس کی توجہ اور عنایت کے طالب ہیں۔ دنیا کی زیب و زینت کی خاطر ہرگز ان سے نظریں نہ پھیرو اور اس شخص کی پیروی نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی ہوائے نفس کی پیروی کرتا ہے اور اس کا معاملہ حد سے گزرا ہوا ہے۔''

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ۝٢٨

واضح سی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو بلاوجہ یہ سزا نہیں دے سکتا کہ اس کے دل کو اپنے ذکر سے غافل کر دے۔ یہ سزا درحقیقت ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے حق سے دشمنی کی راہ کو اپنایا اور تکبر، ہٹ دھرمی یا اندھی تقلید کی بنیاد پر حق سے دشمنی کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ان کے دلوں کو اللہ کی یاد سے غافل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ان کے اعمال کی سزا کے طور پر غفلت کو ان کے دلوں پر مسلط کر دیا ہے۔ لہٰذا اس میں جبر کا کوئی پہلو نہیں ہے۔

یہ غافل افراد ہوائے نفس کی پیروی کرتے ہیں اور ان کے اعمال افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اسی حقیقت کو آیت کے اختتام پر اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ۝٢٨

اس آیت سے بآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ کے ذکر سے غافل ہونا انسان کے اخلاق پر منفی اثرات ڈالتا ہے اور اسے ہوس پرستی اور افراط و تفریط کی طرف دھکیل دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی روح میں ''اللہ'' یا ''ہوائے نفس'' میں سے کوئی ایک ہی اپنا گھر بنا سکتا ہے۔ ان دونوں کا اجتماع ممکن نہیں ہے۔ نفس پرستی اور اتباع ہوائے نفس انسان کو اللہ اور اللہ کی مخلوق سے غافل کر دیتی ہے۔ اللہ کی یاد سے غفلت انسان کو اخلاقی اصولوں سے بیگانہ کر دیتی ہے۔

ساتویں آیت میں بھی روئے سخن رسول اللہ کی طرف ہے اور اللہ تعالیٰ انہیں ان لوگوں سے منہ موڑنے کا حکم دے رہا ہے جو

اللہ کی یاد سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''جن لوگوں نے ہماری یاد سے منہ موڑا اور صرف دنیوی زندگی کے طلبگار رہیں،ان سے منہ موڑ لو۔''

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰی ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۲۹﴾

اس آیت میں ''اللہ کے ذکر'' کی تفسیر میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد قرآن شریف ہے،بعض نے کہا ہے کہ اس سے عقل اور منطقی دلائل مراد ہیں جبکہ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد ایمان ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ ''اللہ کا ذکر'' ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے جس میں یہ ساری چیزیں آجاتی ہیں۔

بعض نے یہ سمجھا ہے کہ یہ آیت ترک جہاد کی دعوت دے رہی ہے۔لہٰذا آیاتِ جہاد نے ان تمام آیات کو منسوخ کر دیا ہے،حالانکہ یہ آیت کسی چیز کو منسوخ نہیں کر رہی ہے بلکہ صرف ان لوگوں کی ہم نشینی کو ترک کرنے کا حکم دے رہی ہے جو اللہ کے ذکر سے غافل ہیں۔

اس آیت میں ''دنیا پرستی'' اور ''ترک ذکر خدا'' کا باہمی تعلق بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔اس طرح اللہ کے ذکر کا اخلاقی فضائل کی پرورش میں اور ترک ذکر کا رذائل اخلاق کی پرورش میں کردار کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

آٹھویں آیت میں تمام مومنین کو خطاب کر کے انہیں اللہ کے ذکر کی طرف دعوت دی جا رہی ہے اور اس کا تاریکیوں سے نکلنے اور نور میں داخل ہونے سے تعلق بیان کیا جا رہا ہے۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو!اللہ کا ذکر کثرت سے کرو اور صبح وشام اس کی تسبیح کرو۔وہی ہے جو تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے تمہارے لیے رحمت کی دعا کرتے ہیں تا کہ وہ تمہیں جہل،شرک اور گناہ کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان،توحید اور تقویٰ کے نور کی طرف تمہاری رہنمائی کرے اور وہ مومنوں پر بہت رحم کرنے والا ہے۔''

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴿۴۱﴾ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿۴۲﴾ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ﴿۴۳﴾

یہ بات قابل غور ہے کہ اہل ایمان کو کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کرنے اور صبح وشام اس کی تسبیح کرنے کا حکم دینے کے بعد اللہ کی رحمت اور فرشتوں کی دعا کا ذکر کرنے کے بعد کہا جا رہا ہے کہ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان تاریکیوں سے نکل کر نور میں آجاتا ہے۔اس سے ہمارا یہی موقف ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کا ذکر اخلاقی رذائل کی تاریکیوں کو دور کرنے میں موثر کردار ادا کرتا ہے اور اسے بتدریج اخلاقی فضائل سے آراستہ کر دیتا ہے۔

تفسیر المیزان میں ہے کہ یہ آیت ''ذکر کثیر'' کی علت کو بیان کررہی ہے۔(المیزان،۶:۳۲۹)

اس آیت میں ذکر کثیر سے کیا مراد ہے؟ اس سوال کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں:

بعض نے کہاا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کو ہرگز فراموش نہ کیا جائے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا ذکر مراد ہے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ اس سے مراد تسبیحات اربعہ کو تیس دفعہ پڑھنا یا تسبیح حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کا پڑھنا مراد ہے۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اللہ نے جو بھی حکم دیا ہے، اس کی حدود مقرر ہیں اور حالت عذر میں وہ حکم ساقط ہوجاتا ہے۔لیکن اللہ کا ذکر ایسا فریضہ ہے جس کی نہ تو کوئی حد مقرر کی گئی ہے اور نہ ہی کسی عذر کی وجہ سے ساقط ہوسکتا ہے۔

بہرحال ذکر کثیر ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے اور مندرجہ بالا تمام امور اس کے ذیل میں آجاتے ہیں۔

اس آیت میں جن ''ظلمات'' اور جس ''نور'' کا ذکر کیا گیا ہے، ان کی بھی مختلف تشریحات کی گئی ہیں۔کسی نے کفر کی تاریکی سے نکل کر ایمان کے نور میں آنا مراد لیا ہے۔کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد مادیات کی تاریکیوں سے نکل کر روحانیت کی دنیا میں آنا ہے اور کسی نے معصیت کی تاریکیوں سے نکل کر اطاعت کے نور میں آنا مراد لیا ہے۔

لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان معنی میں کوئی تضاد نہیں ہے اور یہ سب باہم مراد ہوسکتے ہیں۔اس کے علاوہ رذائل اخلاقی کی تاریکیوں سے نکل کر فضائل اخلاقی کی روشنی میں آنا بھی اس میں داخل ہے اور یہ ذکر الٰہی کا سب سے اہم نتیجہ ہے۔

نویں آیت میں شراب اور جوئے کی آلائش کے برے نتائج کا ذکر کیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''شیطان یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی پیدا کرے اور تمہیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روک دے۔تو کیا (ان نقصانات کے باوجود) تم ان کو ترک کروگے؟''

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ۝۹۱

اس آیت میں شراب اور جوئے کے تین نقصانات کا ذکر کیا گیا ہے۔دشمنی اور عداوت کا وجود میں آنا، اللہ کے ذکر سے روکنا اور نماز سے روکنا۔چونکہ باہمی دوستی ومحبت، اللہ کا ذکر اور نماز عظیم سرمایہ ہیں، اس لیے ان سے محرومیت بہت بڑا نقصان ہے۔

اس کے علاوہ اس آیت کے لب ولہجہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اللہ کے ذکر اور نماز کے ترک کردینے اور بغض و عداوت اور دیگر اخلاقی خرابیوں کی پیدائش میں گہرا تعلق ہے۔

دسویں اور آخری آیت جو کہ آیہ نور کے بعد کی آیت ہے، اس میں ان عظیم الشان الٰہی انسانوں کا ذکر ہے جو ان گھروں کے مکین ہیں جو انوارِ الٰہیہ کے مرکز ہیں۔ان عظیم الشان افراد کی خصوصیات کا ذکر اس طرح کیا جارہا ہے:

''یہ نور الٰہی ان گھروں میں ہے جن کے بارے میں اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کے مقام و مرتبہ کو بلند کیا جائے۔ ایسے گھر جن میں صبح و شام ایسے افراد اللہ کے نام کا ذکر اور اس کی تسبیح کرتے ہیں، جنہیں کوئی تجارت اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کر سکتے۔''

فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۙ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ

(نور: ۳۶،۳۷)

اس طرح نورِ الٰہی کے محافظ ان عظیم انسانوں کی خصوصیت یہ ہے کہ دنیوی امور انہیں اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتے۔ یادِ خدا اور ذکرِ الٰہی ان کا عظیم ترین افتخار اور اعزاز ہے۔ اس کے بعد ان کی دوسری صفات یعنی نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔

نتیجہ

ذکر کے بارے میں قرآن مجید میں اور بھی بہت سی آیات ہیں۔ اختصار کے پیش نظر ہم نے صرف چند آیات کو زیر بحث قرار دیا ہے۔ مندرجہ بالا آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کا ذکر باعث اطمینانِ قلب ہے۔ یہ فحشاء اور منکرات سے باز رکھتا ہے، دشمنانِ حق کے مقابلہ میں انسان کو طاقت اور ہمت دیتا ہے اور بخل، حرص، دنیا پرستی اور دیگر اخلاقی رذائل سے انسان کو پاک کرتا ہے۔

رہروانِ راہِ حق، سالکانِ الی اللہ اور وہ تمام افراد جو تہذیب اخلاق میں مشغول ہیں، ان پر لازم ہے کہ اس کیمیائے سعادت اور اکسیر خوش بختی سے غفلت نہ کریں۔ انہیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ نشیب و فراز اور خطرات سے بھر پور اس راستے پر جو چیز انسان کو ہمت اور قوت دیتی ہے، وہ اللہ کا ذکر ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ذکرِ الٰہی انسان کی زندگی کے مستقل معمولات کا حصہ بن جائے۔

ذکر اور تہذیب نفس کا باہمی تعلق احادیث کی روشنی میں

احادیث میں اللہ کے ذکر کی اہمیت اس قدر وسیع پیمانے پر بیان ہوئی ہے کہ اس مختصر بحث میں اس کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس وقت جو بات ہمارے پیش نظر ہے، وہ یہ ہے کہ تہذیب نفس اور فضائل اخلاقی کی پرورش کے ایک اہم عامل اور محرک کے طور پر اللہ کے ذکر کے بارے میں تحقیق کی جائے۔ اس سلسلہ میں آئمہ معصومین علیہم السلام سے بہت احادیث نقل کی گئی ہیں۔ ہم ذیل میں اس گلستان کے چند پھول پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں جو حضرت علی علیہ السلام کے ارشادات پر مشتمل ہیں اور یہ سب

تصنیف درر الحکم سے لی گئی ہیں:

۱۔ من عمر قلبه بدوام الذکر حسنت افعاله فی السر و الجهر

''جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے دائمی ذکر سے اپنے دل کو آباد کرلیا، اس کے ظاہری و باطنی اعمال اچھے ہو جاتے ہیں۔''

۲۔ مداومة الذکر قوت الارواح ومفتاح الصلاح

''ہمیشہ اللہ کا ذکر کرنا روح کی قوت اور کامیابی کی کنجی ہے۔''

۳۔ اصل صلاح القلب اشتغاله بذکر الله

''اصلاحِ قلب (اور تہذیب نفس) کی بنیاد یہ ہے کہ انسان اللہ کے ذکر میں مشغول رہے۔''

۴۔ ذکر الله دواء اعلال النفوس

''اللہ کا ذکر نفس کی بیماریوں کی دوا ہے۔''

۵۔ ذکر الله رأس مال کل مومن، وربحه السلامة من الشیطان

''اللہ کا ذکر ہر مومن کا سرمایہ ہے جس کا نفع شیطانی وسوسوں سے نجات ہے۔''

۶۔ الذکر جلاء البصائر و نور السرائر

''اللہ کا ذکر بصیرت کی روشنی اور باطن کا نور ہے۔''

۷۔ من ذکر الله سبحانه احی الله قلبه و نور عقله ولبه

''جو اللہ کا ذکر کرتا ہے، اللہ اس کے دل کو زندہ اور اس کی عقل اور شعور کو منور کرتا ہے۔''

۸۔ استدیموا الذکر فانه ینیر القلب، وهو افضل العبادة

''اللہ کا ذکر ہمیشہ کیا کرو، یہ دل کو نورانی کرتا ہے اور سب سے افضل عبادت ہے۔''

۹۔ اذکروا الله ذکرا خالصا تحیوا به افضل الحیاة وتسلکوا به طرق النجاة

(میزان الحکمہ، ۲:۹۶۹)

''اخلاص کے ساتھ اللہ کا ذکر کرو تاکہ سب سے افضل زندگی حاصل کرسکو اور نجات کی راہوں پر چل سکو۔''

۱۰۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کے نام اپنے معروف وصیت نامہ میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

اوصيك بتقوى الله يابنى! ولزوم امره وعمارة قلبك بذكره

''اے فرزند! میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرتے رہو، اس کے احکامات کی پابندی کرو اور اپنے دل کو اس کے ذکر سے آباد کرو۔'' (نہج البلاغہ، مکتوب ۳۱)

۱۱۔ غرر الحکم میں حضرت علی علیہ السلام کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے،

ذكر الله مطردة للشيطان

''اللہ کا ذکر شیطان کو دور بھگانے کا ذریعہ ہے۔''

۱۲۔ حسن اختتام کے طور پر ہم اس بحث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث پر تمام کرتے ہیں:

ذكر الله شفاء القلوب

''اللہ کا ذکر دلوں کی شفا ہے۔'' (کنز العمال، حدیث: ۱۷۵۱)

مندرجہ بالا بارہ احادیث میں جو کچھ بیان ہوا ہے، اس سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ کے ذکر اور تہذیب نفس میں گہرا اور قریبی تعلق پایا جاتا ہے۔ اللہ کا ذکر قلب کو نورانیت بخشتا ہے، تکبر، غرور، غفلت، حسد اور بخل جیسی بیماریوں کو دل سے دور کرتا ہے۔ اللہ کا ذکر شیطان کو دل سے دور کرتا ہے اور انسان کے دل کو ہر قسم کی آلائشات سے پاک کر کے صاف وشفاف کر دیتا ہے۔

علم اخلاق کے بعض علمائے بزرگ کا کہنا ہے کہ انسان کا دل کبھی خالی نہیں ہوسکتا۔ اگر وہ اللہ کے ذکر سے پر ہو تو شیطانی وسوسے اس سے دور ہوجاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر دل اللہ کے ذکر سے خالی ہو تو شیاطین کی جولانگاہ اور اس کے وسوسوں کا مرکز بن جاتا ہے۔

دوسری طرف سے ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات تمام کمالات کا سرچشمہ ہے۔ اس کے ذکر کے ذریعے انسان سرچشمہ کمالات کے قریب ہوجاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رذائل اخلاقی جو حقیقت میں نقائص ہیں، اس سے دور ہوجاتے ہیں۔

لہٰذا رہروانِ سلوک الی اللہ کے لیے ضروری ہے کہ ہر وقت اللہ کے ذکر کی حالت میں رہیں، اس لئے کہ یہ شیطانی طاقتوں کے خلاف ایک تیز شمشیر ہے، قریب حق کی منزل تک لے جانے والا طاقتور مرکب ہے اور راستے کی تاریکیوں کو دور کرنے والا ضوفشاں چراغ ہے۔ ذکر خدا کی بدولت انسان اس مشکل سفر کو تیزی سے طے کرتا ہے اور کمالاتِ انسانی وفضائل اخلاقی تک پہنچنے کی راہوں کو روشن اور ہموار کرتا ہے۔

اس بحث کے اختتام پر تین نکات کا ذکر ضروری ہے:

ا۔ حقیقت ذکر

لغت کی مشہور کتاب ''مفرداتِ راغب'' میں ذکر کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں، ایک کسی چیز کو ذہن میں حاضر کرنا اور

دوسرے معارف وعقائد حقہ کو اپنے قلب وذہن میں محفوظ رکھنا۔

بزرگانِ علم اخلاق کا کہنا ہے کہ اللہ کا ذکر صرف یہ نہیں ہے کہ انسان اللہ کا نام اپنی زبان پر جاری کرلے اور مسلسل تسبیح وتہلیل وتکبیر کہتا رہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے دل کی تمام گہرائیوں سے اللہ تعالیٰ کی عظمت کی طرف متوجہ رہے اور اسے ہر جگہ حاضر وناظر سمجھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرح کا ذکر تمام نیکیوں اور خوبیوں کا سرچشمہ ہے اور انسان کو گناہ سے بچانے کے لیے ایک مضبوط دیوار کا کردار ادا کرتا ہے۔

اسی حقیقت کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن کو انجام دینے کی طاقت اس امت میں نہیں ہے: برادرانِ دینی کے ساتھ مالی ایثار سے پیش آنا، لوگوں کو ان کا حق دینا اور ہر حال میں اللہ کا ذکر کرنا۔ پھر آپؐ نے فرمایا:

ولیس ھو سبحان اللہ والحمدللہ ولا الہ الا اللہ اکبر و لکن اذاورد علی مایحرم علیہ خاف اللہ عزوجل عندہ وترکہ

یعنی ذکر سے مراد صرف سبحان اللہ و............ کہنا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ جب فعل حرام کا موقع سامنے آئے تو انسان اللہ سے ڈر کر اسے ترک کردے۔'' (بحارالانوار، ۹۰:۱۵۱)

حضرت علی علیہ السلام سے مروی ایک اور حدیث میں ہے:

الذکر ذکران: ذکر عندالمصیبۃ حسن جمیل و افضل من ذلك ذکر اللہ عندما حرم اللہ علیك فیکون ذالك حاجزا

''ذکر کی دو اقسام ہیں: مصیبت کے وقت اللہ کو یاد کرنا (اور مصیبت پر صبر کرنا) اچھا عمل ہے مگر اس سے افضل اللہ کا ذکر ہے جو فعل حرام کے وقت تمہیں فعل حرام سے روک دے۔''

(بحارالانوار، ۷۵:۵۵)

مندرجہ بالا مطالب سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ کا واقعی ذکر وہ ہے جو انسان کے وجود کی گہرائیوں پر اثر انداز ہو، انسان کی روح کی پرورش کرے اور اسے اللہ کی راہ کی طرف دعوت دے۔

جو شخص اللہ کا ذکر کرتا ہو اور شیطان کی راہ پر چلتا ہو، درحقیقت وہ اللہ کے ذکر میں مخلص نہیں ہوتا۔ حضرت امام رضا علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

من ذکر اللہ ولم یستبق الی لقائہ فقد استھزء بنفسہ

''جو شخص اللہ کا ذکر کرتا ہے اور اس کی ملاقات کے لیے آگے نہیں بڑھتا (آخرت کے لئے اعمالِ صالحہ نہیں کرتا) وہ اپنے آپ کو بیوقوف بنا رہا ہوتا ہے۔'' (بحارالانوار، ۷۵:۳۵٦)

۲۔درجاتِ ذکر

علم اخلاق کے علمائے بزرگ نے ذکر کے کئی درجات بیان کئے ہیں:

پہلا مرحلہ

اللہ کے ذکر کا پہلا مرحلہ لفظی ذکر ہے۔اس میں انسان اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور اس کی صفاتِ جلال و جمال کا ذکر کرتا ہے اور عام طور پر ان کے مفہوم اور معنی سے بے خبر ہوتا ہے۔جس طرح بہت سے نمازی دورانِ نماز، نماز کے معنی و مفاہیم کو سمجھے بغیر صرف زبان سے اذکار نماز کو ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ذکر کا یہ مرحلہ درحقیقت ذکر کے اعلیٰ درجات کی طرف بڑھنے کا پہلا قدم ہوتا ہے اور اس میں معنی کی مختصر آگاہی بھی ذکر کرنے والے کو حاصل ہوتی ہے۔لیکن یہ ذکر انسان کی تربیت اخلاق اور تزکیہ نفس میں کوئی موثر کردار ادا نہیں کرتا۔

دوسرا مرحلہ

اللہ تعالیٰ کے ذکر کا دوسرا مرحلہ ذکر معنوی ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ جب انسان ذکر لفظی کر رہا ہو تو معنی کی طرف بھی متوجہ ہو۔ظاہری بات ہے کہ معنی کی طرف توجہ کے ساتھ جو ذکر کیا جاتا ہے، وہ انسان پر زیادہ بہتر انداز میں اثر انداز ہوتا ہے۔اگر انسان باقاعدگی کے ساتھ ایسا ذکر کرے تو وہ اس کے اثرات کو اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔

تیسرا مرحلہ

اللہ کے ذکر کا تیسرا مرحلہ قلبی ذکر کا مرحلہ ہے۔اس کی تفسیر میں علماء نے کہا ہے کہ قلبی ذکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ انسان کے دل میں سے اٹھے اور پھر اس کی زبان پر جاری ہو جائے، مثلاً جب وہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں غور و فکر کرتا ہے، کائنات پر حاکم نظم کو جب دیکھتا ہے تو اس کا دل اللہ تعالیٰ کی عظمت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔اس توجہ کے بعد جب وہ کہتا ہے:

العظمۃ للہ الواحد القھار

''ساری عظمت اللہ کے لیے ہے جو واحد اور قہار ہے۔''

تو یہ ذکر دل کی گہرائی سے اٹھنے والا ذکر ہوتا ہے اور درحقیقت انسان کی قلبی کیفیت کا عکاس ہوتا ہے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان کی زبان پر کوئی لفظ جاری ہوئے بغیر اذکارِ الٰہی میں سے کسی ایک کے معنی و مفہوم دل

میں جگمگانے لگتے ہیں جیسے "یاسبوح و یاقدوس اور سبحانك اللهم لا اله انت۔"

یہ قلبی اذکار تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفس میں غیر معمولی تاثیر کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ ذکر فرشتوں کے ذکر کی مانند ہوتا ہے کہ جب انہوں نے اسمائے الٰہیہ کے بارے میں حضرت آدم علیہ السلام کے علم کی وسعتوں کو دیکھا تو بے اختیار بول اٹھے:

سبحانك لا علم لنا الا ما علمتنا انك انت العليم الحكيم

''اے اللہ! تو ہر عیب و نقص سے پاک اور منزہ ہے، جو کچھ تو نے ہمیں تعلیم دیا ہے، ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے، بے شک تو علم و حکمت والا ہے۔''

قرآن مجید میں ذکر کے درجات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ﴿٨﴾

''اپنے رب کے نام کا ذکر کر اور ہر چیز سے منہ موڑ کر اس سے لو لگا۔'' (مزمل: ۸)

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿٢٠٥﴾

''اپنے دل میں تضرع اور خوف کے ساتھ، بغیر آواز بلند کئے صبح و شام اللہ کا ذکر کرو اور غافلوں میں سے نہ ہو جاؤ۔'' (اعراف: ۲۰۵)

ان دو آیات میں سے پہلی آیت میں گہرے ذکر لفظی کا تذکرہ کیا گیا ہے اور "تتبل اليه" یعنی ''ہر چیز سے منہ موڑ کر اللہ سے لو لگانے'' پر بات کا اختتام کیا گیا ہے۔

دوسری آیت میں ذکر قلبی کا تذکرہ کیا گیا ہے جو تضرع اور خوف خدا کے ساتھ ہونا چاہئے اور دل سے اٹھنے والے ذکر مخفی پر بات کو ختم کیا گیا ہے۔

ذکر کی رکاوٹیں

ذکر لفظی کی راہ میں کوئی بڑی اور قابل ذکر رکاوٹیں موجود نہیں ہیں، اس لئے کہ انسان جب چاہے اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور اس کی صفات جلال و جمال کا زبان سے ذکر کر سکتا ہے۔ ہاں! اگر انسان دنیا میں اس قدر غرق ہو جائے کہ اس کے لیے ذکر لفظی کی بھی مجال باقی نہ رہے تو یہ اور معاملہ ہے۔

لیکن ذکر قلبی کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں ہیں جن میں سے سب سے بڑی رکاوٹ انسان کی اپنی طرف سے ہوتی ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور خود ہم سے بڑھ کر ہمارے قریب ہے، جیسا کہ اس آیہ شریفہ میں ہے:

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴿۱۶﴾

''اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔'' (ق:۱۶)

حضرت علی علیہ السلام کی مشہور حدیث میں ہے:

مارأيت شيئا الا ورايت الله قبله وبعده ومعه

''میں نے کوئی چیز نہیں دیکھی جس سے پہلے، جس کے بعد اور جس کے ساتھ اللہ کو نہ دیکھا ہو۔''

(کسی چیز سے پہلے اللہ کو دیکھنے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ اس کا خالق ہے، کسی چیز کے بعد دیکھنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ چیز فنا ہو جائے گی اور اللہ تعالیٰ کی ذات باقی رہے گی اور کسی چیز کے ساتھ دیکھنے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ اس کا حافظ اور اس کا قائم رکھنے والا ہے)۔

مگر اس کے باوجود انسان کے برے اعمال اور اس کی شیطانی صفات اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ضخیم پردہ بن جاتی ہیں اور وہ اس حقیقت سے غافل ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہے۔

دعائے ابوحمزہ ثمالی میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

وانك لا تحتجب عن خلقك الا ان تحجبهم الاعمال دونك

''تو ہرگز اپنی مخلوق سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ ان کے اعمال ہیں جو تیرے اور ان کے درمیان حجاب بن جاتے ہیں۔ خود پرستی اور حب ذات کا حجاب سب سے بڑا حجاب ہے جو ایک قسم کا شرک ہے اور حقیقی توحید کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔''

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

كل ما الهى من ذكر الله فهو من ابليس (میزان الحکمہ، ۲:۹۷۵)

''ہر وہ چیز جو انسان کو اللہ کے ذکر سے غافل کر دے، وہ ابلیس کی طرف سے ہوتی ہے۔''

ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

كل ما الهى عن ذكر الله فهو من الميسر

''ہر وہ چیز جو انسان کو اللہ کے ذکر سے غافل کر دے، وہ جوا ہے۔'' (میزان الحکمہ، ۲:۹۷۵)

یہ بات سب جانتے ہیں کہ قرآن مجید میں جوئے کو شرک کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ (مائدہ:۹۰)

ہم اس بحث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں،

آپؐ سے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا گیا: (منافقون:۹)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! تمہارے اموال و اولاد تمہیں اللہ کے ذکر سے غافل نہ کردیں۔''

آپؐ نے فرمایا:

هم عباد من امتی الصالحون منهم، لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله وعن الصلوة المفروضة الخمس

''یہ میری امت کے صالح افراد ہیں جنہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے اور پنجگانہ نمازوں سے غافل نہیں کرتے۔''(میزان الحکمہ، ۲:۹۷۵)

تیرھواں باب

نمونہ ہائے عمل

اشارہ

ہر انسان اپنی زندگی میں ایسے افراد کی پیروی کرتا ہے جنہیں وہ اپنے لئے نمونہ، اسوہ اور پیشوا سمجھتا ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے آپ کو کردار کے لحاظ سے ان کے قریب کرے اور ان کی صفات کو اپنے اندر پیدا کرے۔

بالفاظِ دیگر ہر انسان کے دل اور جان میں پیشوا اور ہیرو کا ایک خانہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے تاریخ میں ہر قوم کے حقیقی یا فرضی ہیرو اور پیشواؤں کی ایک تعداد ہمیں نظر آتی ہے جن کی شخصیت ان کی تاریخ اور ثقافت کے ایک نمایاں حصے کی بنیاد ہوتی ہے۔ وہ اپنی محافل و مجالس میں ان کا ذکر کرتے ہیں، ان کی تعریف کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ صفات و خصوصیات کے لحاظ سے اپنے آپ کو ان کے قریب کرسکیں۔

اس کے علاوہ قانونِ محاکات (دوسروں جیسا بننا، خاص طور پر عظیم شخصیات کی مانند بننے کی کوشش کرنا) نفسیات کا ایک مسلم قانون ہے۔ اس قانون کے مطابق انسان اپنے اندر دوسروں کی طرف، خصوصاً ہیرو کی طرف جذب ہونے کی ایک کشش محسوس کرتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے اعمال وصفات کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔

جن افراد پر انسان ایمان رکھتا ہو، ان کی طرف کھینچنے والی کشش اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے اسلام میں تولیٰ اور تبریٰ کے نام سے دو اہم اصول پائے جاتے ہیں جنہیں دوسرے الفاظ میں "الحب فی الله" (اللہ کے لیے محبت) اور "البغض فی الله" (اللہ کے لیے دشمنی) سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ ان دو اصولوں کی بنیاد پر ہم سب پر فرض ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے محبت اور اللہ کے دشمنوں سے دشمنی کریں اور پیشوایانِ دینی یعنی رسولؐ اللہ اور آئمہ معصومینؑ کو زندگی کے ہر معاملہ میں اپنے لئے رہنما اور نمونۂ عمل قرار دیں۔

یہ حکم اس قدر اہم ہے کہ قرآنی آیات اسے ایمان کی نشانی اور احادیث میں اسے ایمان کا مضبوط ترین سہارا (**اوثق عری الایمان**) قرار دیا گیا ہے۔ جب تک تولیٰ اور تبریٰ نہ ہوں، انسان کے باقی تمام اعمال اور عبادات و اطاعات بے نتیجہ اور بے ثمر ہو جاتے ہیں۔ ہم اس بارے میں آیات و احادیث کو زیر بحث لائیں گے۔

یہ تولیٰ اور تبریٰ یا بعبارتِ دیگر "الحب فی الله" اور "البغض فی الله"، تہذیب نفس اور سیر و سلوک الی اللہ کی طرف ایک اہم قدم ہے۔

اسی بنیاد پر بہت سے علمائے اخلاق نے رہروانِ راہ حق اور سالکانِ الی اللہ کے لیے مربی اور استاد کے وجود کو لازم قرار دیا

ہے۔ اس سلسلہ میں ہم تولی وتبری سے متعلق آیات کا جائزہ لیتے ہیں:

۱۔ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫

''تمہارے لئے ابراہیمؑ اوران کے ساتھیوں میں اچھا نمونہ ہے جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے، جنہیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، بیزار ہیں۔'' (ممتحنہ:۴)

۲۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝

''تم میں سے جو لوگ اللہ اور روزِ آخرت کی امید رکھتے ہیں، ان کے لیے ان میں اسوۂ حسنہ ہے، جو روگردانی کرے گا تو اللہ غنی وحمید ہے۔'' (ممتحنہ:۶)

۳۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝

''یقیناً تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک اچھا نمونہ ہے، ان لوگوں کے لیے جو اللہ اور روزِ آخرت کی امید رکھتے ہیں اور اللہ کا کثرت سے ذکر کرتے ہیں۔'' (احزاب:۲۱)

۴۔ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ۭ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

''آپ کوئی ایسی قوم نہیں دیکھیں گے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے دشمنوں سے محبت کریں خواہ وہ ان کے باپ، بیٹے، بھائی یا برادری سے ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح کے ذریعے ان کی مدد کی۔ وہ انہیں جنت کے باغوں میں داخل کر دے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ یہ اللہ کی جماعت ہیں اور اللہ کی جماعت ہی

فلاح پانے والی ہے۔'' (مجادلہ:۲۲)

۵۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ (ممتحنہ:۱۳)

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! ان لوگوں سے دوستی نہ کرو جن پر اللہ نے غضب کیا ہے۔''

۶۔ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

''مومنین اور مومنات ایک دوسرے کے ولی ہیں، وہ امر بالمعروف اور نہی از منکر کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔ عنقریب اللہ ان پر رحم کرے گا اور بے شک اللہ غالب اور حکیم ہے۔'' (توبہ:۷۱)

۷۔ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ڛ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗــــُٔـھُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

''اللہ ان لوگوں کا ولی ہے جو ایمان لائے، وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے۔ جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے ولی شیطان ہیں جو انہیں نور سے نکال کر تاریکیوں کی طرف لاتے ہیں۔ یہ لوگ اہل جہنم ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔'' (بقرہ:۲۵۷)

۸۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرتے رہو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔'' (توبہ:۱۱۹)

تفسیر اور نتیجہ

سورۂ ممتحنہ کی آیات سے یہ بات بخوبی نظر آتی ہے کہ بعض نومسلم افراد کے کفار کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے۔ اس سورت کی ابتدائی آیات کے شانِ نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح مکہ سے قبل حاطب ابن ابی بلتعہ نام کے ایک صحابی نے سارہ نامی ایک عورت کے ہاتھ اہل مکہ کو ایک خفیہ خط بھیجا کہ رسولؐ اللہ مکہ پر حملہ کرنے اور مکہ کو فتح کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ تم اپنے دفاع کا انتظام کر لو۔

رسولؐ اللہ کا جنگی منصوبہ یہ تھا کہ اہل مکہ کو ان کے اس حملے کی خبر نہ ہو سکے تا کہ وہ کسی قسم کا مقابلہ نہ کر سکیں اور جنگ میں

خونریزی کم از کم ہو۔اس عورت نے خط اپنے بالوں میں چھپایا اور مکہ کی طرف روانہ ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھیج کر رسول اللہ کو اس واقعہ کی خبر دی۔آپؐ نے حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کو اس عورت کے تعاقب میں بھیجا۔پہلے تو اس عورت نے خط کا انکار کیا مگر جب حضرت علی علیہ السلام نے سخت اقدام کی دھمکی دی تو اس نے خط نکال کر انؑ کے حوالے کر دیا۔حضرت علی علیہ السلام یہ خط لے کر رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

حاطب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش کیا گیا اور اس کی سخت سرزنش کی گئی۔اس نے اپنی اس حرکت پر اپنا عذر پیش کیا جو بظاہر آنحضرتؐ نے قبول فرما لیا اس کے بعد سورہ ممتحنہ کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن میں اس عمل پر سرزنش کی گئی تاکہ مستقبل میں اس عمل کا سد باب کیا جا سکے۔ان آیات نے ایک اہم اسلامی اصول یعنی ''نیک لوگوں اور اولیاء اللہ کی اقتداء اور بدکاروں اور دشمنانِ خدا سے قطع تعلق کے اصول'' کو واضح کر دیا جسے دوسرے الفاظ میں ''الحب فی اللہ'' اور ''البغض فی اللہ'' کہا جاتا ہے۔

اس سورت کے آغاز میں تمام مومنین کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ:

''اے اہل ایمان! میرے اور اپنے دشمن کو دوست نہ بناؤ،تم ان سے دوستی اور محبت کا اظہار کرتے ہو جبکہ وہ اس وحی کا انکار کرتے ہیں جو تم پر نازل ہوئی ہے اور انہوں نے اللہ کے رسولؐ کو اور تم کو اس لئے تمہارے شہر سے جلاوطن کیا کہ تم ایمان لائے۔''(ممتحنہ:۱)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ؕ

یہ نکتہ بالکل واضح ہے کہ اگر دوستانہ تعلقات اور ایمانی تعلقات کے باہمی ٹکراؤ کی حالت میں دوستانہ تعلقات کو ایمانی تعلقات پر مقدم رکھا جائے تو ایمان وعقیدہ کی بنیادیں سست اور متزلزل ہو جاتی ہیں اور انسان بتدریج باطل کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے۔''الحب فی اللہ'' اور ''البغض فی اللہ''، یا اللہ کے دوستوں سے تولیٰ اور اللہ کے دشمنوں سے تبریٰ کا راز بھی یہی ہے۔

اس کے بعد اس سورت کی چوتھی آیت میں تمام مسلمانوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی پیروی کرنے کا حکم دیا گیا ہے،انہیں اہل ایمان کے لیے اسوہ حسنہ اور خوبصورت نمونہ عمل قرار دیا ہے اور کہا ہے:

''ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں میں تمہارے لئے اچھا نمونہ عمل ہے۔جب انہوں نے اپنی مشرک قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے بیزار ہیں جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کو پوجتے ہو۔''

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫

''اسوہ'' اصل میں اس حالت کو کہتے ہیں جو دوسروں کے پیروی کرنے سے حاصل ہو۔ بالفاظ دیگر اس سے مراد اقتداء کرنا اور پیروی کرنا ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ اسوہ ہونے والی خصوصیت اچھے کاموں میں بھی ہوسکتی ہے اور برے کاموں میں بھی۔ اسی لئے اس آیت میں اسوہَ کے ساتھ حسنہ کی صفت بھی بیان کی گئی ہے۔ یعنی ابراہیمؑ اور ان کے ساتھی تمہارے لئے اچھا نمونۂ عمل ہیں، اس لئے کہ انہوں نے اپنی قوم کے ساتھ ظاہری اور مادی تعلقات کو ایمانی تعلقات پر قربان کر دیا۔

دوسری آیت میں مذکورہ بالا آیت کی بحث کو آگے بڑھایا گیا ہے اور ایک بار پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کے طرزِ عمل کی طرف اشارہ کر کے فرمایا جا رہا ہے:

''تم مسلمانوں کے لیے ان کی زندگی میں اچھا نمونۂ عمل ہے۔ یہ نمونۂ عمل ان لوگوں کے لیے ہے جو اللہ اور روزِ آخرت کی امید رکھتے ہیں اور جو کوئی (ان مردانِ حق کی پیروی سے) روگردانی کرے گا (اور اللہ کے دشمنوں کے ساتھ دوستی کرے گا، وہ اپنا نقصان کرے گا اور اللہ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے) وہ سب سے بے نیاز اور ہر تعریف کا حقدار ہے۔''

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝

یہ آیت دو چیزوں میں گزشتہ آیت سے مختلف ہے:

ایک یہ کہ اس آیت میں ''الحب فی اللہ'' اور ''البغض فی اللہ'' کو اللہ اور آخرت پر ایمان کا ثمر قرار دیا گیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمہارے اس طرزِ عمل کی اللہ کو کوئی ضرورت نہیں ہے، یہ تو تمہاری اپنی روحانی اور معنوی ترقی کے لیے اور تمہاری قومی اور معاشرتی سلامتی کے لیے ضروری ہے۔

تیسری آیت کی نظر جنگ احزاب پر ہے اور اس میں اس اہم نکتہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی تمام تر کمزوری، بے صبری اور ان میں سے بعض کی بدگمانیوں کے باوجود رسولؐ اللہ ثابت قدم رہے اور کسی بھی لمحہ بہترین جنگی حکمت عملی سے غافل نہیں ہوئے۔ آپؐ نے اپنے دست مبارک میں کدال لے کر خندق کھودنے کا کام انجام دیا، اپنے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے بذلہ سنجی اور مزاح بھی فرماتے تھے اور مسلمانوں کو جذبۂ جہاد ابھارنے والے اشعار پڑھنے اور سنانے کی تلقین بھی فرماتے تھے۔ ان سب کے باوجود ایک لحظہ کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ ہوئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس شدید دباؤ کی حالت میں آپؐ مسلمانوں کو مستقبل میں عظیم کامیابیوں کی خوشخبری بھی دیتے تھے۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی مختصر جمعیت، اسلام دشمن قبائل کے اتحاد کے خلاف منظم اور ثابت قدم رہی۔

رسولؐ اللہ کا یہ طرزِ عمل تمام مسلمانوں کے لیے ایک حیرت انگیز نمونۂ عمل اور اسوۂ حسنہ تھا۔

قرآن مجید فرماتا ہے: (جنگ احزاب میں)

''رسولؐ اللہ تمہارے لئے اسوہ حسنہ تھے، ان لوگوں کے لیے جو اللہ اور روزِ آخرت کی امید رکھتے ہیں اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے ہیں۔''

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿٢١﴾

رسولؐ اللہ صرف میدانِ جنگ میں، جو کہ جہادِ اصغر کا معرکہ تھا، مسلمانوں کے لیے اسوۂ حسنہ نہیں تھے بلکہ نفس کے خلاف جہاد میں بھی، جو جہادِ اکبر کہلاتا ہے، انتہائی اہم نمونۂ عمل تھے۔ جو کوئی آنحضرتؐ کے نقش قدم پر چل سکے، وہ تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفس کی دشوار اور نشیب و فراز سے بھرپور راہوں پر سرعت سے آگے بڑھ سکے گا۔

یہاں پر یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ اس آیت میں ''اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنے'' پر بھی زور دیا گیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرتے ہیں، وہی رسولؐ اللہ جیسے عظیم قائد کی پیروی کر سکتے ہیں۔ اس لئے ایمان اور اللہ کا ذکر انہیں ان کی عظیم ذمہ داریوں اور فرائض کی طرف متوجہ کرتے ہیں جن کی انجام دہی کے لیے وہ ایک رہبر اور قائد کی جستجو کرتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہتر قائد اور رہنما نہیں پاتے۔

چوتھی آیت میں نکتہ مقابل یعنی ''البغض فی اللہ'' پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''تم کوئی ایسی قوم نہیں دیکھو گے جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے دشمنوں سے دوستی کرتی ہو، خواہ وہ ان کے باپ، بیٹے، بھائی اور رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ اللہ نے ان کے دلوں پر ایمان لکھ دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح کے ذریعے ان کی قوت بہم پہنچائی ہے۔''

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ

یہ آیت نہایت واضح طور پر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اگر انسان خونی رشتوں اور ایمانی رشتوں کے باہمی ٹکراؤ کے مقام پر آ جائے تو اسے کن تعلقات کو مقدم رکھنا چاہئے۔ یہ آیت انتہائی واضح الفاظ میں بتا رہی ہے کہ اگر تمہارے قریبی ترین رشتہ دار بھی اللہ کی راہ سے منحرف ہو جائیں اور کفر و فساد کی آلودگی سے آلودہ ہو جائیں تو ان سے تعلق توڑ کر اللہ اور اعلیٰ

اقدار سے تعلق قائم کرو۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات میں وزن اور پختگی پیدا کرنے کے لیے یہ دو انتہائی بامعنی جملے بھی ارشاد فرمائے:

أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ

''اللہ نے ایمان ان کے دلوں میں لکھ دیا ہے اور ایک روحِ الٰہی کے ذریعے ان کی مدد فرمائی۔''

بالفاظِ دیگر ''الحب فی اللہ'' اور ''البغض فی اللہ'' کا سرچشمہ اور جڑ ایمان ہے اور ایمان کا استمرار اور بقا بھی ''الحب فی اللہ'' اور ''البغض فی اللہ'' میں پوشیدہ ہے۔

اس طرح ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ دونوں ایک دوسرے پر براہِ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ اللہ اور آخرت پر ایمان سے یہ سفر شروع ہوتا ہے اور ''الحب فی اللہ'' اور ''البغض فی اللہ'' سے اس کی تکمیل ہوتی ہے۔

(پانچویں آیت کی تفسیر اصل متن میں نہیں دی گئی ہے)۔

چھٹی آیت میں مومنین ومومنات کے روحانی اور معنوی تعلق کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے ولی ہیں، امر بالمعروف اور نہی از منکر کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔ عنقریب اللہ ان پر رحم کرے گا، بے شک اللہ عزیز وحکیم ہے۔''

امر بالمعروف اور نہی از منکر، نماز، زکوٰۃ اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کی بنیاد پر قائم یہ روحانی تعلق اس بات کا سبب بنتا ہے کہ وہ صرف اعمال وکردار میں ہی نہیں بلکہ اخلاقی صفات میں بھی ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے نمونۂ عمل بنتے ہیں۔ لہٰذا اگر اہل ایمان کو کسی گروہ یا جماعت کا ہمرنگ ہونا ہو تو وہ اس گروہ مومنین کے ہمرنگ بنیں۔

امر بالمعروف اور نہی از منکر ان مومنین کے اعمال میں برسرفہرست ہے جس سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ ان کی یہ خصوصیت انہیں اس بات پر مائل کرتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے اعمال واخلاق کا بھی خیال رکھیں۔ یہ بذات خود تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفس کا ایک موثر عمل ہے۔

ساتویں آیت میں مومنین اور کافروں کے طرزِ فکر وعمل کا فرق واضح کیا گیا ہے۔ مومنین اللہ سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں اور اس کی صفات جلال وجمال سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ کفار طاغوت سے وابستہ ہوتے ہیں اور ان کے اعمال واخلاق میں بھی طاغوتی صفات کا اظہار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اللہ مومنین کا ولی اور سرپرست ہے۔ وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتا ہے جبکہ جن

لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی، ان کے ولی وسرپرست طاغوت ہیں جو انہیں نور سے نکال کر تاریکی کی طرف لے آتے ہیں۔ یہ اہل جہنم ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔"

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۙ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَوْلِیٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ یُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵۷﴾

اس آیت میں تاریکیوں سے نکل کر نور کی طرف آنے کو اللہ کی ولایت کا نتیجہ اور نور سے نکل کر تاریکیوں کی طرف آنے کو ولایت طاغوت کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ اس آیت میں نور سے مراد تمام نیکیاں اور اخلاقی فضائل ہیں جبکہ ظلمت میں تمام برے اعمال اور اخلاقی رذائل شامل ہیں۔

جوشخص اللہ کی ولایت کے زیر سایہ ہوتا ہے، وہ رذائل سے فضائل اور برائیوں سے نیکیوں کی طرف ہجرت کا سفر شروع کر دیتا ہے، اس لئے کہ وہ ہر جگہ اللہ کی صفات جلال و جمال سے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ وہ نیکی اور پاکیزگی کی طرف بڑھتا رہتا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر برائی اور پلیدی سے پاک ہے۔ وہ رحمت، سخاوت اور بخشش کی طرف حرکت کرتا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ رحمن ورحیم اور جواد وکریم ہے۔

جولوگ ولایت طاغوت کے زیر سایہ ہوتے ہیں، ان کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ وہ فضائل کی طرف سے رذائل کی طرف حرکت کرتے ہیں اور اس طرح تاریکیوں کی طرف آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

آٹھویں آیت میں تمام مومنین کو خطاب کر کے حکم دیا گیا ہے:

"اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور صادقین کے ساتھ ہو جاؤ۔"

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۱۱۹﴾

درحقیقت ان دو جملوں میں سے دوسرا جملہ "كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ"، پہلے جملے "اتَّقُوا اللّٰهَ" کی تکمیل کر رہا ہے، اس لئے کہ تقویٰ اور پرہیز گاری کی راہ پر چلنا اس وقت ممکن ہی نہیں ہے جب تک انسان صادقین کی صحبت اختیار کر کے ان کی صحبت کے زیر سایہ قدم نہ اٹھائے۔

اہل سنت اور اہل تشیع کی بہت سی روایات میں حضرت علی علیہ السلام یا اہل بیتؑ کے تمام افراد کو صادقین کا مصداق قرار دیا گیا ہے۔ اہل سنت کی روایات کا مطالعہ کرنے کے لیے الدرالمنثور، مناقب خوارزمی، درالسمطین، شواہد التنزیل وغیرہ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

حافظ سلیمان قندوزی نے ینابیع المودۃ میں، علامہ حموینی نے فرائد السمطین میں اور شیخ ابوالحسن کازرونی نے شرف النبی میں

ان میں سے کچھ روایات نقل کی ہیں۔

ان میں سے ایک حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو سلمان فارسیؓ نے رسولؐ اللہ سے پوچھا کہ یہ آیت عام ہے یا خاص؟

آپؐ نے فرمایا:

اما المامورون فعامة المومنين، و اما لصادقون فخاصة اخی علی واوصيائه من بعده الی يوم القيامة

''اس آیت میں حکم عام ہے جس میں تمام مومنین شامل ہیں جبکہ صادقین خاص ہیں، میرا بھائی علیؑ اور قیامت کے دن تک ان کے اوصیاء۔'' (ینابیع المودۃ:۱۱۵)

ظاہر سی بات ہے کہ علیؑ اور انؑ کے اوصیاء جن کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا، ان کے ساتھ ہونے کا اس کے سوا کوئی مقصد نہیں ہے کہ انسان اخلاق و عمل میں ان کی پیروی کرے۔

نتیجہ

تولیٰ و تبریٰ سے متعلق مندرجہ بالا آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اولیاء اللہ سے تعلق قائم کرنا اور ظالموں، فاسدوں اور طاغوتوں سے تعلق توڑنا یعنی ''الحب فی اللہ'' اور ''البغض فی اللہ'' قرآن کی سب سے بنیادی تعلیمات میں سے ایک ہے اور اس کا اخلاقیات پر بہت گہرا اثر مرتب ہوتا ہے۔

یہ قرآنی اور اسلامی اصول زندگی کے تمام مسائل پر براہ راست اثر انداز ہوتا ہے، خواہ ان کا تعلق فردی و اجتماعی زندگی سے ہو یا دنیوی و اخروی معاملات سے۔ اسی طرح اخلاقی مسائل پر بھی، جو اس وقت ہمارا موضوع بحث ہے، یہ اصول غیر معمولی طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔

یہ اصول مومنین کی شخصیت کو بناتا ہے۔ ان کا تزکیہ نفس کرتا ہے، انہیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ ہر قدم پر نیک اور پاکیزہ افراد، خصوصاً رسولؐ اللہ اور آئمہ معصومینؑ کو اپنا اسوۂ عمل قرار دیں، اس لئے کہ یہ انسانی خلقت کے مقصد کے حصول یعنی تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفس اور فضائل اخلاقی کی پرورش کے لیے ایک موثر قدم ہے۔

تولیٰ و تبریٰ احادیث کی روشنی میں

شیعہ اور سنی دونوں کی کتب احادیث میں ''الحب فی اللہ'' اور ''البغض فی اللہ'' یعنی تولیٰ و تبریٰ کے بارے میں بکثرت روایات مندرج ہیں اور جتنی اہمیت اس مسئلہ کو دی گئی ہے، شاید ہی کسی اور چیز کو دی گئی ہو۔

اس مسئلہ کی غیر معمولی اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ اللہ اور اولیاء اللہ سے دوستی و محبت اور دشمنانِ حق سے بیزاری کے بہت اہم اور مثبت اثرات رونما ہوتے ہیں جن کا مشاہدہ ایمان کی قوت، تہذیب اخلاق اور اعمال کی پاکیزگی اور تقویٰ میں کیا جا سکتا ہے۔

ان احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تہذیب نفس اور سیر و سلوک الی اللہ کی راہ پر چلنے والے ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ کسی پیشوا اور رہنما کا دامن تھام لے۔ ہم یہاں چند احادیث نقل کرتے ہیں:

۱۔ خطبۂ قاصعہ میں رسولؐ اللہ اور حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں ایک خوبصورت عبارت ملتی ہے:

ولقد قرن الله به من لدن ان كان فطيما اعظم ملك من ملائكته يسلك به طريق المكارم، و محاسن اخلاق العالم، ليله و نهاره و لقد كنت اتبعه اتباع الفصيل اثر امه يرفع لي في كل يوم من اخلاقه علما و يامرني بالاقتداء

''جب سے رسولؐ اللہ کی شیر خوارگی کا زمانہ ختم ہوا، اللہ تعالیٰ نے اپنا سب سے بڑا فرشتہ ان کے ساتھ مقرر فرما دیا جو شب و روز انہیں اعلیٰ اخلاقی صفات کی راہ پر چلاتا تھا اور میں اس طرح ان کے پیچھے چلتا تھا، جیسے اونٹنی کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے چلتا ہے، وہ ہر روز اپنے اخلاق کا ایک علم نصب فرماتے تھے اور مجھے اس کی پیروی کرنے کا حکم دیتے تھے۔'' (نہج البلاغہ: ۱۹۲)

خطبۂ قاصعہ کے اس اقتباس سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کا عظیم ترین فرشتہ آغازِ طفولیت سے رسولؐ اللہ کی رہنمائی کے لیے مامور تھا، اسی طرح حضرت علی علیہ السلام بھی رسولؐ اللہ کی اتباع کرتے تھے اور اس طرح ان کے پیچھے پیچھے چلتے تھے جیسے اونٹنی کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے چلتا ہے اور رسولؐ اللہ بھی ہر روز انہیں ایک نئی اخلاقی صفت کا درس دیتے تھے۔

جب رسولؐ اللہ اور حضرت علیہ علیہ السلام جیسی عظیم شخصیات رہنما اور پیشوا کی ضرورت مند تھیں تو دوسروں کی ضرورت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

۲۔ زرارہ نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے یہ حدیث نقل کی ہے:

بنى الاسلام على خمسة اشياء، على الصلوة و الزكاة و الحج و الصوم والولاية، قال زرارة: فقلت: و اى شيء من ذلك افضل؟ فقال: الولاية افضل لا نها مفتاحهن والوالي هو الدليل عليهن

''اسلام کی عمارت پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے: نماز، زکوٰۃ، حج، روزہ اور ولایت۔ زرارہ کہتے ہیں میں نے پوچھا کہ ان میں سب سے افضل کیا چیز ہے؟ آپؑ نے فرمایا: ولایت سب سے افضل ہے کیونکہ وہ ان کی کنجی ہے اور والی ان سب کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔'' (اصولِ کافی، ۱۸:۲)

اس حدیث سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ولایت اور اولیاء اللہ کی اقتداء کرنا تمام عبادات اور اعمال کے لیے بنیادی ضرورت ہے۔ یہاں سے تہذیب اخلاق، تزکیہ نفس اور اعلیٰ اخلاقی صفات کے حصول کے لیے بھی ولایت کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

۳۔ ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ایک دن رسولؐ اللہ نے صحابہ سے پوچھا:

ای عری الایمان اوثق؟ فقالوا: الله و رسوله اعلم و قال بعضهم الصلوة و قال بعضهم الزكاة، وقال بعضهم الصيام، وقال بعضهم الحج و العمرة، و قال بعضهم الجهاد، فقال رسول الله لكل ما قلتم فضل و ليس به، و لكن اوثق عرى الايمان الحب في الله و البغض في الله و تولى اولياء الله و التبرى من اعداء الله

''ایمان کے دستوں (handles) میں سے کونسا دستہ سب سے مضبوط ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔ بعض نے کہا نماز، بعض نے کہا روزہ، بعض نے کہا زکوٰۃ، بعض نے کہا حج، بعض نے کہا جہاد۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا: جن چیزوں کا تم نے نام لیا، وہ سب بافضیلت اعمال ہیں لیکن میرے سوال کا جواب نہیں ہیں۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ایمان کا سب سے مضبوط دستہ یہ ہے کہ محبت اور دشمنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ہوں اور انسان اللہ تعالیٰ کے دوستوں سے دوستی اور اس کے دشمنوں سے قطع تعلق کرے۔'' (کافی، ۲:۱۲۵)

اس حدیث میں لفظ ''عری'' استعمال ہوا ہے جو عروہ کی جمع ہے۔ عروہ کسی چیز کے دستہ کو کہتے ہیں جس کی مدد سے اسے پکڑا جاتا ہے۔ اس حدیث میں استعمال ہونے والا لفظ ''ایمان کا دستہ'' اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ قربِ الی اللہ کی منزل تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کسی چیز کو دستے کی طرح مضبوطی سے پکڑ لے اور قرب الی اللہ کی طرف بڑھتا چلا جائے۔ اس سلسلہ میں ''الحب فی الله'' اور ''البغض فی الله'' سے زیادہ مضبوط اور قابل اعتماد دستہ کوئی نہیں ہے۔

۴۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے ایک صحابی جابر سے فرمایا:

اذا اردت ان تعلم ان فيك خيرا فانظر الى قلبك فان كان يحب اهل طاعة الله و يبغض اهل معصيته، ففيك خير، و الله يحبك؛ و ان كان يبغض اهل طاعة الله و يحب اهل معصيته، فليس فيك خير، والله يبغضك والمرء مع من احب

''اگر تم یہ دیکھنا چاہو کہ تمہارے دل میں خیر اور نیکی موجود ہے یا نہیں تو اپنے دل کا جائزہ لو۔ اگر وہ اللہ

کی اطاعت کرنے والوں سے محبت اور اس کی نافرمانی کرنے والوں سے نفرت کرتا ہے تو تم اچھے انسان ہو اور اللہ تم سے محبت کرتا ہے۔ اس کے برعکس اگر اللہ کی اطاعت کرنے والوں سے نفرت اور اس کی نافرمانی کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے تو تم میں نیکی نہیں پائی جاتی اور اللہ تم سے نفرت کرتا ہے۔ انسان اسی کے ساتھ ہوتا ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے۔'' (اصولِ کافی، ۲:۱۲۶)

اس حدیث کا یہ جملہ ''المرء مع من احب'' یعنی ''انسان اسی کے ساتھ ہوتا ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے،'' اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ ہر انسان اپنے اخلاق و عادات میں اور اخروی انجام کے لحاظ سے انہی لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جن سے وہ محبت کرتا ہے۔

اس طرح اس حدیث سے بھی اخلاقی مسائل پر ''ولایت'' کی تاثیر بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔

۵۔ ایک حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

ود المومن للمومن فی اللہ من اعظم شعب الایمان، الا و من احب فی اللہ و ابغض فی اللہ و اعطی فی اللہ و منع فی اللہ فھو من اصفیاء اللہ

''ایک مومن کا اپنے مومن بھائی سے اللہ کی خوشنودی کے لیے محبت کرنا ایمان کا سب سے بڑا شعبہ ہے۔ یاد رکھو کہ جو شخص اللہ کے لیے دوستی کرتا ہے، اللہ کے لیے دشمنی کرتا ہے، اللہ کے لیے کسی کو کچھ دیتا ہے اور اللہ کے لیے کسی سے کوئی چیز روکتا ہے تو وہ اللہ کے برگزیدہ بندوں میں سے ہو جاتا ہے۔''

(بحار الانوار، ۶۶:۲۴۰)

۶۔ حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

اذا جمع اللہ عزوجل الاولین والآخرین قام مناد فنادی یسمع الناس فیقول، این المتحابون فی اللہ قال: فیقوم عنق من الناس فیقال الھم اذھبوا الی الجنۃ بغیر حساب قال: فتلقاھم الملائکۃ فیقولون الی این؟ فیقولون الی الجنۃ بغیر حساب! قال فیقولون فان ضرب انتم من الناس؟ فیقولون نحن المتحابون فی اللہ، قال فیقولون وای شیء کانت اعمالکم قالوا کنا نحب فی اللہ و نبغض فی اللہ، قال فیقولون نعم اجر العالمین

''جب اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اولین و آخرین کو جمع کرے گا تو ایک منادی ندا دے گا جس کی آواز

سب سنیں گے۔ وہ کہے گا کہ اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرنے والے کہاں ہیں؟ اس وقت کچھ لوگ اٹھیں گے اور انہیں کہا جائے گا کہ بغیر حساب کے جنت میں داخل ہو جاؤ۔ فرشتے ان کا استقبال کریں گے اور ان سے کہیں گے کہ تم کہاں جا رہے ہو؟ وہ جواب دیں گے کہ ہم بغیر حساب کے جنت میں جا رہے ہیں۔ فرشتے پوچھیں گے کہ تم کون لوگ ہو؟ وہ کہیں گے کہ ہم اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ان سے پوچھا جائے گا کہ تمہارے اعمال کیا تھے؟ وہ کہیں گے کہ اگر ہم کسی سے محبت کرتے تھے تو وہ بھی اللہ کے لیے ہوتی تھی۔ فرشتے کہیں گے کہ عمل کرنے والوں کے لیے اچھا اجر ہے۔'' (بحار الانوار، ٦٦: ٢٤٠)

یہ جملہ ''نعم اجر العاملین''، یعنی ''عمل کرنے والوں کے لیے اچھا اجر ہے''، اس حقیقت کو آشکار کر رہا کہ اولیاء اللہ سے محبت اور دشمنانِ خدا سے دشمنی، تمام اچھے اعمال کی انجام دہی اور برے اعمال سے اجتناب کا بنیادی سبب ہے۔

۷۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ایک حدیث میں ہے: (بحار الانوار، ٦٦: ٣٥٢)

ان حول العرش منابر من نور علیها قوم لباسهم ووجوههم نور لیسوا بانبیاء یغبطهم الانبیاء والشهداء قالوا یارسول الله حل لنا قال: هم المتحابون فی الله و المتحالسون فی الله و المتزاورون فی الله

''عرش کے اردگرد نور کے منبر ہیں۔ ان پر ایسے افراد ہوں گے جن کے چہرے اور لباس نور کے ہوں گے۔ وہ نبی نہیں ہوں گے مگر انبیاء اور شہداء ان پر رشک کریں گے۔ رسولؐ اللہ سے پوچھا گیا: یارسولؐ اللہ! یہ کون لوگ ہوں گے؟ آپؐ نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، اللہ کے لیے ایک دوسرے کے پاس بیٹھتے ہیں اور اللہ کے لیے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔''

۸۔ ایک اور حدیث میں (یا مندرجہ بالا حدیث کے استمرار میں) رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

لو ان عبدین تحابا فی الله احدهما بالمشرق والآخر بالمغرب لجمع الله بینهما یوم القیامة وقال النبی افضل الاعمال الحب فی الله و البغض فی الله

(بحار الانوار، ٦٦: ٣٥٢)

''اگر اللہ کے دو بندے، اللہ کی خوشنودی کے لیے ایک دوسرے سے محبت کریں اور ان میں سے ایک

مشرق میں رہتا ہو اور دوسرا مغرب میں، قیامت کے روز اللہ تعالیٰ جنت میں انہیں ایک جگہ جمع کر دے گا۔ پھر آپؐ نے فرمایا: سب سے افضل عمل "الحب فی اللہ" اور "البغض فی اللہ" ہے۔"

اس حدیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسانوں کے درمیان ایمانی رشتہ ہر رشتے سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ یہ رشتہ ان کے درمیان اخلاق و اعمال میں ہم آہنگی بھی پیدا کرتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ جب لوگ اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوں اور ایک دوسرے میں ان افعال وصفات کا مشاہدہ کرتے ہوں جو اللہ کو پسند ہیں تو یہ "الحب فی اللہ" و "البغض فی اللہ" ان کی اخلاقی تربیت اور تزکیہ نفس میں موثر کردار ادا کرتے ہیں۔

۹۔ ایک حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

هل عملت لی عملا؟ قال صليت لك و صمت و تصدقت و ذكرت لك، قال الله تبارك و تعالىٰ، و اما الصلوة فلك برهان، و الصوم جنة و الصدقة ظل، و الذكر نور، فاى عمل عملت لى؟ قال موسى: دلنى على العمل الذى هو لك، قال ياموسى هل و اليت فى وليا وهل عاديت لى عدوا قط فعلم موسى ان افضل الاعمال الحب فى الله و البغض فى الله

"اے موسیٰ! کیا تو نے کبھی کوئی عمل میرے لئے بھی انجام دیا ہے؟ موسیٰ نے جواب دیا: یا اللہ! میں نے تیرے لئے نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، صدقات دیئے اور تیرا ذکر کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نماز تو تمہاری اپنی رہنما ہے، روزہ تمہارے لئے ڈھال ہے، صدقہ تمہارے لئے سایہ ہے، ذکر تیرے لئے نور ہے، میرے لئے تو نے کیا کیا؟ موسیٰ نے کہا: یا اللہ! تو اس عمل کی طرف میری رہنمائی فرما جو تیرے لئے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! کیا تو نے کبھی میرے لئے ولی سے محبت کی ہے اور کیا تو نے کبھی میرے لئے کسی دشمن سے دشمنی کی ہے؟ موسیٰ علیہ السلام سمجھ گئے کہ سب سے افضل عمل "الحب فی اللہ" و "البغض فی اللہ" ہے۔" (بحار الانوار، ۶۶:۲۵۲)

۱۰۔ ہم اس بحث کو امام جعفر صادق علیہ السلام کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں (اگرچہ اس موضوع پر احادیث کی تعداد بہت زیادہ ہے)۔

من احب لله و ابغض لله و اعطى لله و منع لله فهو ممن كمل ايمانه

"جو شخص اللہ کے لیے محبت کرے، اللہ کے لیے دشمنی کرے، اللہ کے لیے کسی کو کچھ دے اور اللہ کے

لیے کسی کو نہ دے تو اس کا ایمان درجۂ کمال کو پہنچ گیا۔''(بحارالانوار،٦٦:٢٥٢)

مندرجہ بالا احادیث سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام میں ''الحب فی اللہ'' و''البغض فی اللہ''قرآن کوغیر معمولی اہمیت دی گئی ہے اور اسے افضل ترین عمل قرار دیا گیا ہے۔ اسے کمالِ ایمان کی علامت اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد سے بھی افضل قرار دیا گیا ہے۔ اس صفت کے حامل افراد دوسروں سے پہلے اور بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے اور انہیں وہ مقام دیا جائے گا جس پر انبیاء وشہداء بھی رشک کریں گے۔

ان احادیث کی روشنی میں ولایت اور تولیٰ وتبریٰ کی تمام دینی امور میں اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔ اس کی وجہ بھی بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ انسان بزرگانِ دین سے ان کے ایمان،تقویٰ، اخلاقی فضائل اور اعمال صالحہ کی وجہ سے محبت کرتا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے اعمال وکردار میں ان کی پیروی نہ کرے اور ان کی شخصیت کا پرتو اپنی شخصیت میں پیدا کرنے کی کوشش نہ کرے۔

اسی حقیقت کو علمائے اخلاق نے اس طرح بھی بیان کیا ہے کہ سیر وسلوک میں کامیابی کے لیے انسانِ کامل کی اقتداء لازمی شرط ہے۔

قرآن مجید نے مختلف مقامات پر انبیاء کے مختلف واقعات کا ذکر کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کو ان کی پیروی کا حکم دیا ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ ان کی زندگی کو اپنی زندگی کے لیے نمونۂ عمل قرار دیں اور کامیابی ونجات کے سفر میں ان کی زندگی سے سبق حاصل کریں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ عام طور پر لوگوں میں قہرمان پرستی (Hero worship) کا رجحان پایا جاتا ہے۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اپنی زندگی میں کسی عظیم شخصیت سے محبت کرے اور اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں اس کی پیروی کرے۔

کسی ایسے ہیرو کا انتخاب انسان کی زندگی کو کوئی شکل وصورت دینے میں بہت موثر کردار ادا کرتا ہے۔ ہیرو کی شناخت اور ان کے بارے میں انسان کا نقطہ نظر بدل جانے سے انسان کی زندگی کا انداز بھی بدل جاتا ہے۔

بہت سے افراد یا اقوام کسی حقیقی ہیرو تک رسائی نہ ہونے کی وجہ سے کوئی خیالی یا دیومالائی ہیرو بنا لیتے ہیں اور اپنے شعروادب میں ان کی تعریف وستائش کے انبار لگا دیتے ہیں۔ کسی بھی قوم کے معاشرتی حالات اور پروپیگنڈہ مشینری کا قہرمان سازی میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ یہی چیزیں باعث بنتی ہیں کہ کسی قوم کے ہیرو اللہ تعالیٰ کے عظیم بندے، سیاسی شخصیات، کھلاڑی یا فلمی اداکار بن جاتے ہیں۔

حقیقی ہیرو کی شناخت کے لیے انسان کے اس فطری رجحان کی درست سمت میں رہنمائی کرنے سے فرد اور معاشرہ کی اخلاقی تربیت میں بہت مدد ملتی ہے۔

اولیاء اللہ سے محبت کا فلسفہ بھی یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن وحدیث میں مسئلہ ولایت کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے اور اس کے بغیر تمام دینی اعمال کو ناقص قرار دیا گیا ہے۔

داستانِ موسیٰ وخضر

استاد اور مرشد کا انتخاب تزکیہ نفس اور سیر وسلوک الی اللہ میں اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ بعض اوقات اللہ عالیٰ نے انبیاء کو بھی حکم دیا کہ ایک خاص مدت کے لیے کسی مرشد اور رہنما کی پیروی کریں۔

اس سلسلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ جو قرآن مجید میں بیان ہوا ہے، انتہائی اہم اور معنویت سے بھرپور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ کچھ علوم کے حصول کے لیے، جن کا تعلق اخلاق وعمل سے تھا، اپنے دور کے ایک عالم اور پیغمبر کے پاس جا کر کسب فیض کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اس عالم اور پیغمبر کا ذکر اس طرح فرمایا ہے:

عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿٦٥﴾

''ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ جسے ہم نے اپنی رحمت سے نوازا اور اسے اپنی طرف سے علم عطا کیا۔'' (کہف:٦٥)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رخت سفر باندھا اور اپنے ایک ساتھی کے ساتھ حضرت خضر علیہ السلام کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کے پاس پہنچ کر انہوں نے ان سے حصولِ علم کی خواہش کا اظہار کیا۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف دیکھا اور کہا:

''میں نہیں سمجھتا کہ تم میری تعلیمات کو برداشت کرنے کا صبر وحوصلہ دکھا سکو۔''

مگر موسیٰ علیہ السلام نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ صبر وحوصلہ کا مظاہرہ کریں گے۔

اس کے بعد تین اہم واقعات رونما ہوتے ہیں۔ پہلے وہ دونوں ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ حضرت خضرؑ نے کشتی میں سوراخ کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فوراً اعتراض کر دیا کہ آپؑ کے اس عمل سے کشتی ڈوب سکتی ہے۔ حضرت خضرؑ نے کہا: میں نے تم سے کہا تھا کہ تم صبر نہیں کر سکو گے۔ حضرت موسیٰ نے معذرت کی اور اعتراض نہ کرنے کا وعدہ کیا اور دونوں آگے بڑھنے لگے۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد انہوں نے ایک نوجوان کو دیکھا۔ حضرت خضرؑ نے اسے دیکھتے ہی قتل کر دیا۔ جب حضرت موسیٰ نے بظاہر ایک بے گناہ نوجوان کے قتل کا خوفناک منظر دیکھا تو دامنِ صبر ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ انہوں نے پہلے سے زیادہ شدید لہجہ میں اعتراض کرتے ہوئے کہا: آپؑ نے ایک بے گناہ معصوم جان کو قتل کر دیا۔ یہ تو یقیناً ایک برا عمل ہے۔

حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰ کو ان کا وعدۂ خاموشی یاد دلایا اور کہا کہ اگر اب تم بولے تو پھر تمہارا راستہ میرے راستے سے الگ ہو جائے گا۔ موسیٰ بھی سمجھ گئے کہ یقیناً اس میں کوئی اہم راز ہے۔ وہ خاموش ہو گئے اور موقع کا انتظار کرنے لگے کہ حضرت خضرؑ خود ان واقعات کی حقیقت سے پردہ اٹھائیں۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک اور واقعہ رونما ہو گیا۔ حضرت خضرؑ اور حضرت موسیٰ ایک بستی میں داخل ہوئے۔ بستی کے لوگوں نے ان کی مہمان نوازی نہ کی اور کھانا تک کھلانے پر تیار نہ ہوئے۔ حضرت خضرؑ نے ایک دیوار دیکھی جو انتہائی بوسیدہ تھی اور کسی بھی وقت گر

سکتی تھی۔ انہوں نے آستیں چڑھائی اور حضرت موسیٰ کو بھی کام پر لگا یا اور دیوار کی مرمت کر دی تا کہ وہ گر نہ جائے۔ ایک بار پھر حضرت موسیٰ اپنا وعدہ خاموشی بھول گئے اور کہنے لگے: کیا اس بستی کے یہ بے مروت لوگ اس محبت آمیز رویے کے مستحق ہیں؟ اس موقع پر حضرت خضرؑ نے یہ فیصلہ سنا دیا کہ اس کے بعد تمہارا راستہ میرے راستے سے الگ ہے۔ لیکن جدائی سے پہلے انہوں نے ان تینوں کاموں کی حقیقت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ظاہر کر دی۔

کشتی کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ ایک ظالم و جابر بادشاہ دریا میں موجود صحیح و سالم کشتیوں کو ملاحوں سے چھین لیتا تھا۔ میں نے کشتی میں سوراخ کر کے اس میں عیب پیدا کر دیا تا کہ اس ظالم بادشاہ کی دستبرد سے محفوظ رہے اور اس کشتی کے غریب ملاح اپنی روٹی روزی کے اس وسیلہ سے محروم نہ ہو جائیں۔

جس نوجوان کو میں نے قتل کیا، وہ مرتد اور کافر ہو گیا تھا اور سزائے موت کا مستحق تھا۔ اس بات کا خطرہ بھی موجود تھا کہ وہ اپنے نیک ماں باپ پر دباؤ ڈال کر ان کو بھی بے دین بنا دیتا۔

باقی رہ گئی دیوار، تو وہ اس بستی کے دو یتیم لڑکوں کی تھی۔ اس کے نیچے ان کا خزانہ دبا ہوا تھا۔ ان کا باپ ایک نیک انسان تھا۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ ان کا خزانہ محفوظ رہے۔ پھر انہوں نے کہا کہ میں نے ان میں سے کوئی کام بھی اپنی مرضی سے نہیں کیا بلکہ یہ تینوں کام اللہ کے حکم سے کئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام، علم و معرفت کا ایک ذخیرہ حضرت خضر علیہ السلام سے لے کر ان سے الگ ہو کر اپنی منزل کی طرف چل پڑے۔ انہوں نے اس عظیم معلم اور مربی سے مندرجہ ذیل سبق حاصل کئے:

۱۔ ایک عالم اور حکیم رہنما کو تلاش کرنا اور اس کے علم و اخلاق سے روشنی اصل کرنا اس قدر اہم ہے کہ حضرت موسیٰ جیسے الوالعزم نبی کو حکم دیا گیا کہ دور دراز کا فاصلہ طے کر کے ایسے رہنما کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے روشنی حاصل کریں۔

۲۔ کسی کام میں جلد بازی نہیں کرنی چاہئے، اس لئے کہ بہت سے کاموں کے لیے مناسب وقت اور فرصت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ "الامور رھنیۃ باوقتھا"، "ہر کام اپنے وقت پر انجام پاتا ہے۔"

۳۔ ہمارے اردگرد جو حوادث اور واقعات رونما ہوتے ہیں، ان کے ظاہری پہلو کے ساتھ ساتھ ایک باطنی پہلو بھی ہوتا ہے۔ کسی واقعہ کے ظاہری اور ناخوشگوار پہلو کو دیکھ کر اسی کو ساری حقیقت سمجھ کر جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہیں کر لینا چاہئے۔ کسی بھی معاملہ کے بارے میں فیصلہ کرنے سے قبل اس کے باطن کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

۴۔ معنوی عہد و پیمان کو بار بار توڑنے کے نتیجہ میں ممکن ہے کہ انسان ہمیشہ کے لیے ان کے فوائد و برکات سے محروم ہو جائے۔

۵۔ کمزور طبقات کی حمایت، یتیموں کی خیر خواہی اور ظالموں کے خلاف جنگ ایسے فرائض ہیں جنہیں ہر قیمت پر ادا کرنا ضروری ہے۔

۶۔ انسان جتنا بھی زیادہ علم رکھتا ہو، اسے اپنے علم پر مغرور نہیں ہونا چاہئے اور اسے یہ بات ضرور مدنظر رکھنی چاہئے کہ اس کے

علم سے آگے اور بھی علوم موجود ہیں۔ اگر انسان اپنے علم کو ہی علم کا کمال سمجھ لے تو اس سے اس کی ترقی کا سفر رک جاتا ہے۔

۷۔ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے مخصوص کارندے خاموشی اور اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے مظلوم اور بے یار و مددگار بندوں کی مدد کرنے میں سرگرم عمل رہتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے مخصوص الطاف وعنایات میں سے ہے جن کی توقع ہر صاحب ایمان کر سکتا ہے۔

یہ واقعہ خواہ حضرت موسیٰ کی تعلیم و تربیت کے لیے تھا یا دوسروں کے لیے ایک نمونہ اور مثال تھا، اس سے ہماری بحث متاثر نہیں ہوتی، اس لئے کہ جو سبق ہم اس سے سیکھ رہے ہیں، وہ ایک حقیقت ہے۔

مختصر یہ کہ علم میں اضافہ اور تہذیب نفس کے لیے رہبر اور پیشوا کی ضرورت اور اہمیت قابل انکار نہیں ہے۔

چودھواں باب

ولایت کا ایک اور چہرہ اور تہذیب نفوس میں اس کا کردار

تہذیب نفس اور سیر و سلوک الی اللہ سے متعلق امور اور اخلاقیات پر ولایت کی تاثیر کا عقیدہ صرف اس بنیاد پر نہیں کہ اولیاء اللہ اور ان کی ہدایات قول و فعل کے لیے ایک نمونہ اور اسوہ ہیں بلکہ بعض علمائے بزرگ کے عقیدہ کے مطابق ولایت کی ایک اور قسم بھی موجود ہے جسے ولایت تکوینی کہا جاتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اولیائے الٰہی، تربیت کے قابل افراد میں براہِ راست تصرف کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ رسولؐ اور امامؑ انسانی معاشرے کے دل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو عضو دل کے ساتھ زیادہ تعلق رکھتا ہو اور اس کے ساتھ جس قدر زیادہ ہم آہنگ ہو، وہ اسی قدر زیادہ فیضیاب ہوتا ہے، یا اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ نبیؐ اور امامؑ چمکتے ہوئے سورج کی مانند ہوتے ہیں۔ اگر تکبر، خود پسندی اور نفس پرستی کے بادل انسان کی روح اور دل پر سایہ فگن نہ ہوں تو اس آفتاب ولایت کی روشنی ایسے انسان کی روحانی نشو و نما کرنے اور اسے پر اثر بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

یہاں ولایت ایک اور صورت میں رونما ہوتی ہے اور ظاہری تصرفات سے آگے بڑھ کر ایک غیر مرئی اور پر اسرار تاثیر اختیار کر لیتی ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۴۵﴾ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿۴۶﴾ (احزاب: ۴۵،۴۶)

''اے نبیؐ! ہم نے تمہیں گواہ، بشارت دینے والا، خبردار کرنے والا، اللہ کے اذن سے اس کی طرف بلانے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔''

یہ روشن چراغ اور آفتاب درخشاں سالکانِ راہ قرب کی راہوں کو ہی روشن نہیں کرتا بلکہ انسان کے وجود پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور نفوس کو نشو و نما دے کر معنوی ارتقاء کی طرف لے چلتا ہے۔

ہشام بن حکم اور اہل سنت کے ماہر علم کلام عالم عمرو بن عبید کے درمیان ہونے والا مناظرہ بھی اس بات کی ایک دلیل ہے۔

ہشام بن حکم مسجد بصرہ میں داخل ہوئے۔ لوگ عمرو بن عبید کے گرد اجتماع کئے ہوئے تھے۔ ہشام بن حکم نے مجمع کو چیرتے ہوئے عمرو بن عبید کے قریب جا کر کہا کہ میں ایک اجنبی مسافر ہوں، اگر آپ کی اجازت ہو تو سوال کرنا چاہتا ہوں؟

عمرو: جی فرمائیے!

ہشام: آیا آپ کی آنکھیں ہیں؟

عمرو: بیٹا یہ کیسا سوال کر رہے ہو؟ جو چیز تمہیں نظر آ رہی ہے، اس کے بارے میں سوال کر رہے ہو؟

ہشام: میرے سوالات کچھ اسی قسم کے ہیں، اگر آپ اجازت فرمائیں تو میں سلسلہ جاری رکھوں؟

عمرو: (غرور سے بھرے ہوئے لہجے میں) پوچھو، خواہ تمہارے سوال احمقانہ ہی کیوں نہ ہوں۔

ہشام نے اپنا مذکورہ سوال دہرایا اور عمرو نے اس کا مثبت جواب دیا۔

ہشام: آپ اپنی آنکھوں سے کیا کام لیتے ہیں؟

عمرو: رنگوں اور چیزوں کو دیکھتا ہوں۔

اس کے بعد ہشام نے منہ، کان، ناک کے بارے میں ایسے ہی سیدھے سادھے سوال کئے اور سیدھے سادھے جواب سنے۔ آخر میں ہشام نے پوچھا:

ہشام: کیا آپ کے پاس دل ہے اور آپ اس سے کیا کام لیتے ہیں؟

عمرو: میرے تمام اعضاء و جوارح مجھے جو پیغام اور اطلاعات دیتے ہیں، دل کی مدد سے ان کا جائزہ لیتا ہوں (اور ان سے مناسب کام لیتا ہوں)۔

ہشام: کیا اعضا و حواس ہمیں قلب سے بے نیاز نہیں کرتے؟

عمرو: نہیں، اس لئے کہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ جو اس سے غلطی سرزد ہو جائے، دل انہیں اس خطا سے محفوظ رکھتا ہے۔

یہاں ہشام نے اصل وار کرتے ہوئے کہا:

اے ابومروان! (یہ عمرو بن عبید کی کنیت تھی) جب اللہ تعالیٰ نے انسان کے اعضاء و جوارح کو امام اور رہنما کے بغیر نہیں چھوڑا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ عالم انسانیت کو امام کے بغیر، حیرت و سرگردانی میں چھوڑ دے اور ان کے لیے کوئی امام مقرر نہ کرے؟

عمرو بن عبید یہاں اصل نکتہ کی طرف متوجہ ہو گیا اور خاموش ہو گیا اور سمجھ گیا کہ یہ جوان ہشام بن حکم ہے۔ اس نے ہشام بن حکم کو احترام کے ساتھ اپنے پہلو میں بٹھایا۔

جب امام جعفر صادق علیہ السلام نے ہشام سے یہ واقعہ سنا تو آپؑ نے تبسم فرمایا اور پوچھا:

''یہ منطق کس نے تمہیں سکھائی؟''

ہشام نے جواب دیا کہ یہ آپؑ کی صحبت کا فیض ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

''اللہ کی قسم! یہ بات صحف ابراہیمؑ وموسیٰ میں بیان ہوئی ہے۔'' (اصولِ کافی، ۱:۱۶۹، خلاصہ)

بلاشبہ امامؑ عالم انسانیت کا قلب ہے۔ اس طرح یہ حدیث امام کی ولایت و ہدایت تشریعی یا تکوینی یا دونوں پر دلالت کر رہی ہے۔

ابوبصیراوران کے ایک پڑوسی جس نے نئی نئی توبہ کی تھی، کے درمیان ہونے والی گفتگو بھی اسی حقیقت کی ایک اور دلیل ہے۔

ابوبصیر کہتے ہیں کہ میرا ایک ہمسایہ جو (بنی امیہ یا بنی عباس کی) ظالم حکومت کا کارندہ تھا اور اس ملازمت کے ذریعہ اس نے بہت مال و دولت جمع کر لی تھی۔ وہ عیش وعشرت اور شراب خوری کی محفلیں سجاتا اور اپنے دوستوں کو ان میں دعوت دیتا تھا۔ میں نے متعدد بار اس سے اس چیز کی شکایت کی مگر وہ باز نہ آیا۔ جب میں نے زیادہ اصرار کیا تو اس نے کہا کہ میں ایک گناہگار انسان ہوں جبکہ تم ایک نیک اور پاکیزہ انسان ہو۔ اگر تم میرے حال سے اپنے امامؑ، امام جعفر صادق علیہ السلام کو خبر دو تو میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کے وسیلہ سے مجھے گناہوں کی زندگی سے نجات دے۔

ابوبصیر کہتے ہیں کہ اس کی بات کا میرے دل پر گہرا اثر ہوا۔ جب میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے اس کی حالت امام علیہ السلام کی خدمت میں بیان کی۔ آپؑ نے فرمایا کہ جب تم کوفہ واپس جاؤ اور وہ تمہیں ملنے آئے تو اسے کہنا کہ جعفرؑ بن محمدؑ تمہیں سلام کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر تم گناہ ترک کر دو تو میں تمہیں جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔

ابوبصیر کہتے ہیں کہ جب میں کوفہ گیا تو وہ مجھے ملنے آیا اور میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کا پیغام اسے پہنچایا۔ امامؑ کا پیغام سن کر اس کے دل پر گہرا اثر ہوا اور وہ فرطِ جذبات سے رونے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پوچھا کہ تمہیں اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں، کیا واقعی جعفرؑ بن محمدؑ نے ایسا کہا ہے؟

ابوبصیر نے قسم کھا کر اسے یقین دلایا کہ امامؑ نے یہ پیغام دیا ہے۔ اس نے کہا کہ میرے لئے یہی کافی ہے اور یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

چند روز بعد اس نے مجھے بلا بھیجا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنے گھر میں دروازے کے پیچھے تقریباً برہنہ حالت میں کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا کہ میرے گھر میں جو کچھ (مالِ حرام) تھا، وہ سب میں نے اپنے گھر سے نکال دیا ہے۔ جن اموال کے مالکوں کو میں جانتا تھا، وہ ان کے مالکوں کو لوٹا دیئے ہیں اور جن اموال کے مالکوں کو نہیں جانتا تھا، وہ ان کی طرف سے فقراء میں تقسیم کر دیئے ہیں۔ اب جو میری حالت ہے، وہ تمہارے سامنے ہے۔

ابوبصیر کہتے ہیں کہ میں نے برادرانِ مومن کی مدد سے اس کے لیے لباس اور دیگر ضروریاتِ زندگی فراہم کیں۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اس نے مجھے پیغام بھیجا کہ میں بیمار ہوں۔ میں اس کے پاس گیا۔ میں باقاعدگی سے اس کی عیادت کرتا رہا اور اس کا علاج بھی کروایا مگر اسے افاقہ نہ ہوا۔ آخر کار اس کی موت کا وقت قریب آ گیا۔

میں اس کے قریب بیٹھا ہوا تھا اور وہ حالت نزع میں تھا۔ پھر اس پر بیہوشی طاری ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہوش میں آیا اور بولا:

''ابوبصیر! تمہارے امامؑ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔''

یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کرلیں اور جان، جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔

ابوبصیر کہتے ہیں کہ کچھ عرصہ بعد میں حج کے لیے مکہ گیا۔ اس کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں جیسے ہی امامؑ کے گھر میں داخل ہوا، آپؑ نے بغیر کسی تمہید کے کمرے کے اندر سے اونچی آواز میں فرمایا:

''ابوبصیر! ہم نے تمہارے دوست سے جو وعدہ کیا تھا، وہ پورا کر دیا (اور اس نے بھی اپنا وعدہ پورا کیا)۔''

(بحارالانوار، ۴۷:۱۴۵)

ممکن ہے یہ واقعہ تو بہ کا ایک عام واقعہ ہو لیکن اس بات کے پیش نظر کہ وہ شخص غیر معمولی طور پر گناہگار تھا اور اس نے یہ اقرار بھی کر لیا کہ وہ امامؑ کی نظر عنایت کے بغیر شیطان کے چنگل سے آزاد نہیں ہوسکتا۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس شخص کے اندر رونما ہونے والی یہ تبدیلی امامؑ کے تصرف کا نتیجہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے دل میں نورِ ولایت کا کوئی نقطہ موجود تھا اور وہی اس چیز کا باعث ہوا کہ امامؑ نے اس میں تصرف کیا اور اسے نجات بخشی۔

تہذیب نفس میں اس معنوی تاثیر اور ولایت تکوینی کا ایک اور نمونہ یہ واقعہ ہے جو علامہ مجلسیؒ نے بحارالانوار میں نقل کیا ہے:

''جب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ہارون کی قید میں تھے تو اس نے ایک حسین و جمیل کنیز آپؑ کے پاس بھیجی۔ (بظاہر اس کا مقصد امامؑ کی خدمت کرنا تھا مگر اصل میں اس کا مقصد آپ کو فریب دینا تھا) جب امامؑ نے اس کو دیکھا تو یہ آیت پڑھی جو ملکہ سباء کے ہدایا و تحائف کو دیکھ کر حضرت سلیمانؑ نے پڑھی تھی:

بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ۝۳۶

''بلکہ تم ہی اپنے ہدیہ پر فرحت محسوس کرتے ہو۔'' (نمل:۳۶)

پھر آپؑ نے فرمایا: ''مجھے اس کنیز کی اور اس جیسی چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔''

ہارون اس جواب پر غضبناک ہوا اور اپنا ایلچی امامؑ کے پاس بھیجا کہ انہیں یہ پیغام دے کر ہم نے آپؑ کی مرضی اور اجازت سے آپؑ کو گرفتار اور قید نہیں کیا ہے اور کہا کہ کنیز کو ان کے پاس چھوڑ کر آؤ۔

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ہارون نے ایک خادم بھیجا تا کہ یہ دیکھے کہ وہ کنیز امامؑ پر اثر انداز ہوتی ہے یا نہیں؟ خادم نے واپس جا کر ہارون کو خبر دی کہ کنیز مسلسل جسدہ کی حالت میں تھی اور یہ کہے جا رہی تھی:

قدوس سبحانك سبحانك

اور اس نے سجدے سے سر نہیں اٹھایا۔

ہارون نے کہا: ''اللہ کی قسم! موسیٰ ابن جعفرؑ نے اس پر جادو کر دیا ہے۔''

پھر اس نے حکم دیا کہ کنیز کو اس کے سامنے حاضر کیا جائے۔ جب کنیز کو ہارون کے سامنے لایا گیا تو خشیتِ الٰہی سے اس پر لرزہ طاری تھا اور اس کی نظریں آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

ہارون نے اسے دیکھ کر سوال کیا کہ تمہارا کیا معاملہ ہے؟

کنیز نے جواب دیا: میرے اندر ایک نئی حالت پیدا ہوگئی ہے۔ جب میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے پاس تھی تو میں نے دیکھا کہ آپؑ شب وروز مسلسل نماز پڑھتے تھے۔ نماز سے فارغ ہوکر اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتقدیس میں مشغول ہوجاتے۔ ایک بار میں نے کہا کہ مجھے آپؑ کی خدمت کے لیے بھیجا گیا ہے، اگر آپؑ کی کوئی حاجت ہوتو فرمایئے؟

امام علیہ السلام نے ایک طرف اشارہ کیا اور فرمایا: یہ کیا کر رہے ہیں؟

میں نے دیکھا تو مجھے ایک وسیع وعریض باغ نظر آیا جس کی حدیں نظر نہیں آرہی تھیں۔ یہ باغ پھولوں سے بھرا ہوا تھا اور جگہ جگہ ریشمی قالین بچھے ہوئے تھے۔ حسین وجمیل خادموں کی کثیر تعداد خدمت کے لیے آمادہ تھی۔ انہوں نے سبز حریر کے لباس پہنے ہوئے تھے اور یاقوت کے تاج ان کے سروں پر رکھے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ہاتھ دھونے کے لیے آفتابے، ہاتھ خشک کرنے کے لیے تولئے تھے اور انواع واقسام کے کھانے آمادہ تھے۔ یہ دیکھ کر میں حالت سجدہ میں گر گئی، سجدے میں ہی تھی کہ اس خادم نے مجھے اٹھایا۔ جب میں نے سر اٹھایا تو اپنی جگہ پر تھی۔

ہارون نے کہا:

''اے خبیث عورت! شاید تو نے سجدہ کیا اور سجدے میں سوگئی اور یہ سب کچھ خواب میں دیکھا۔''

کنیز نے کہا: اللہ کی قسم! میرے آقا! ایسا نہیں ہے۔ پہلے میں نے یہ منظر دیکھا اور بعد میں سجدہ کیا۔

ہارون نے خادم کو حکم دیا کہ اس خبیث عورت کو لے جاؤ اور اسے اپنے پاس نظر بند کرو تا کہ کوئی اس کی یہ کہانی نہ سن سکے۔

کنیز فوراً نماز میں مشغول ہوگئی۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ ایسا کیوں کر رہی ہو تو اس نے جواب دیا:

''میں نے عبد صالح (یعنی امام موسیٰ کاظم علیہ السلام) کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔''

پھر اس نے مزید کہا کہ جب میں وہ سارے مناظر دیکھ رہی تھی تو میں نے حورانِ جنت کو دیکھا جنہوں نے مجھ سے کہا:

''عبد صالح سے دور ہوجاؤ تا کہ ہم داخل ہوسکیں، ان کی خدمت گار ہم ہیں، تم نہیں!''

یہ کنیز اسی حالت میں رہی، یہاں تک کہ اس دنیا سے چل بسی۔ (بحارالانوار، ۲۳۹:۴۸)

اس واقعہ میں بھی تربیت کی قابلیت رکھنے والے نفوس میں ائمؑہ کے معنوی نفوذ اور تاثیر کا نمونہ نظر آتا ہے۔ مختصر یہ کہ رسولؐ اللہ اور آئمہ معصومینؑ کی تاریخ میں ایسے بہت سے واقعات نظر آتے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی شخص ان عظیم ہستیوں سے ایک ملاقات کے نتیجہ میں ہی مکمل طور پر تبدیل ہوگیا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان اولیائے کامل نے ان لوگوں پر ایسی نظر عنایت کی جس کے نتیجہ میں ان کے اندر یہ عظیم انقلاب رونما ہوگیا۔ اس تصرف کو دوسرے الفاظ میں ولایت تکوینی کہا جاتا ہے۔

یہ بات بھی ضرور مدنظر رہے کہ ایسی نظر عنایت بے سبب نہیں ہوتی۔ جن لوگوں پر یہ نظر عنایت ہوتی ہے، ان میں بھی ضرور کوئی ایسی بات ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا امام معصومؑ کی نظر عنایت کے مستحق بنتے ہیں۔

علامہ مطہری شہید کا نظریہ

علامہ مرتضیٰ مطہری شہید اپنی کتاب "ولاء ھا وولایتھا" میں فرماتے ہیں:

''عام طور پر یہ دو الفاظ چار معنی میں استعمال ہوتے ہیں: ولائے محبت، یعنی اہل بیتؑ سے عشق و محبت، ولائے امامت یعنی آئمہؑ کو افعال و کردار میں نمونہ عمل قرار دینا، ولائے زعامت یعنی آئمہؑ کو سیاسی اور معاشرتی امور میں اپنا حاکم ماننا اور ولائے تصرف یا د لائے معنوی جو کہ ولایت کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔''

اس کے بعد وہ ان میں سے ہر ایک کی وضاحت کرتے ہوئے چوتھے معنی کی وضاحت کے ضمن میں کہتے ہیں:

''معنوی ولایت یا تصرف ایک غیر معمولی تکوینی تصرف ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اللہ کی عبادت کے نتیجہ میں قرب الٰہی کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں وہ انسان کامل کا مقام و مرتبہ حاصل کر لیتا ہے۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد وہ معنویات کا قافلہ سالار بن جاتا ہے۔ اسے لوگوں کے باطن پر تسلط حاصل ہو جاتا ہے، وہ لوگوں کے اعمال کا گواہ اور حجت زمان ہو جاتا ہے۔

شیعہ عقیدہ کے مطابق ہر دور میں ایک انسان کامل موجود ہوتا ہے جو انسان اور کائنات پر غیبی تسلط رکھتا ہے، وہ ارواح و قلوب پر بھی نظر رکھتا ہے اور اسے حجت خدا کہا جاتا ہے۔

ولایت تکوینی کے معنی یہ نہیں ہیں، جیسا کہ بعض جاہلوں نے سمجھ رکھا ہے کہ کوئی انسان کائنات کا سرپرست بن کر اللہ کی طرف سے نظامِ زمین و آسمان کو چلانے اور خلق و رزق کے امور کا چلانے والا بن جائے۔

اگر چہ ایسا عقیدہ رکھنا شرک نہیں ہے بلکہ اس بات کے ساتھ شباہت رکھتا ہے جو اللہ نے فرشتوں کے مدبرات امر اور مقسمات امر ہونے کے حوالے سے کہی ہے۔ لیکن قرآن ہمیں یہ حکم دیتا ہے کہ ہم خلق کرنے، رزق دینے، زندہ کرنے اور مارنے جیسے امور کو اللہ کے سوا کسی کی طرف نسبت نہ دیں۔

بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کامل قرب الٰہی کے نتیجہ میں ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں اسے کائنات کے بعض امور پر تصرف حاصل ہو جاتا ہے۔''

اس کے بعد وہ فرماتے ہیں:

''یہاں اس بات کی طرف مختصر اشارہ کر دینا کافی ہے کہ یہ طرزِ فکر قرآنی معنی و مفاہیم پر مبنی ہے تا کہ کسی کو یہ گمان نہ ہو کہ یہ کوئی قلندرانہ یا ملنگانہ بات ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ ولایت کے چوتھے معنی کا تعلق عرفانی مسائل سے ہے لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ چونکہ اس کا تعلق عرفانی مسائل سے ہے، لہٰذا اسے رد کر دیا جائے۔''

اس کے بعد وہ بہت سے پہلوؤں کی وضاحت کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

''بنابرایں یہ محال اور ناممکن ہے کہ انسان اللہ کی اطاعت اور بندگی کے نتیجہ میں فرشتوں کے مقام تک یا ان کے مقام سے بالاتر مقام پر نہ پہنچ پائے یا کم از کم ان کمالات کو حاصل نہ کر سکے جو ایک فرشتے کو حاصل ہیں (وہ فرشتے اذن الٰہی سے کائنات میں تصرف اور تدبیر کا اختیار رکھتے ہیں)۔''

مرتضیٰ مطہری شہید کے ان بیانات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان انسان ہائے کامل کے ساتھ معنوی تعلق سے انسان کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ ان پر روحانی طور پر اثر انداز ہو سکیں اور انہیں بتدریج رذائل اخلاق سے دور کر کے فضائل و کمالات کے قریب لا سکیں۔

ناجائز مفاد پرستی

ہر دور میں اور ہر قوم میں ایسے افراد موجود ہوتے ہیں جو مفاہیم سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں مگر اس سے ان صحیح مفاہیم کی صحت متاثر نہیں ہوتی اور نہ ہی ان کی قداست میں کوئی فرق پڑتا ہے۔

تہذیب نفس اور سلوک الی اللہ کی راہ میں موثر پیشرفت کے لیے استاد اور مرشد کی ضرورت بھی انہی مسائل میں سے ہے جن سے سوئے استفادہ کیا گیا ہے (ناجائز فائدہ اٹھایا گیا ہے)۔

صوفیاء میں سے بعض افراد نے اپنے آپ کو مرشد، شیخ، پیر طریقت اور قطب وغیرہ جیسے عنوان دے کر لوگوں کو اپنی بے قید و شرط پیروی کی دعوت دینا شروع کر دی۔ اس معاملہ میں وہ اس حد تک بڑھ گئے کہ انہوں نے کہہ دیا کہ اگر آپ پیر طریقت کو کوئی غیر شرعی عمل انجام دیتے دیکھیں تو ہرگز ان پر اعتراض نہ کریں، اس لئے کہ ان پر اعتراض کرنا روح تسلیم کے خلاف ہے۔

امام غزالی کا اہل تصوف کی طرح رجحان ان کی کتاب ''احیاء العلوم'' میں ان کے بیانات سے ظاہر ہے اور اہل تصوف بھی انہیں اپنے بزرگوں میں شمار کرتے ہیں۔ غزالی اسی کتاب کے باب ۵ کی فصل ۱۵ میں کہتے ہیں:

''شیخ کے سامنے مریدوں کا باادب ہونا صوفیاء کے آداب میں سب سے اہم ہے۔ مرید کو شیخ کے سامنے بے اختیار ہونا چاہئے۔ اسے چاہئے کہ شیخ کی اجازت کے بغیر اپنے جان و مال میں کوئی تصرف نہ کرے............شیخ کے سامنے مرید کا بہترین ادب خاموشی اور جمود ہے، یہاں تک کہ شیخ جب، جو کچھ مناسب سمجھے، اسے کرنے کو کہے۔ اگر اسے شیخ کا کوئی عمل خلافِ شریعت دکھائی دے اور اس کا سمجھنا اس پر دشوار ہو تو حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ کو یاد کرنا چاہئے۔ حضرت موسیٰ حضرت خضرؑ کے کاموں کو غلط سمجھ کر اعتراض کرتے رہے مگر جب حضرت خضر علیہ السلام نے ان افعال کی حقیقت بیان کی تو موسیٰ نے اپنے اعتراض واپس لے لئے۔ لہٰذا شیخ جو بھی عمل انجام دیتا ہے، اس کی کوئی حکمت ہوتی ہے۔'' (احیاء العلوم، ۵:۱۹۸)

شیخ عطار، یوسف بن حسین رازی کے حالات میں لکھتے ہیں:

''جب ان کے مرشد، ذوالنون مصری نے انہیں حکم دیا کہ مصر کو چھوڑ کر اپنے شہر چلے جائیں تو یوسف نے ان سے ہدایات طلب کیں۔ ذوالنون نے جواب دیا: جو کچھ تم نے پڑھا ہے، اسے بھول جاؤ اور جو کچھ تم نے لکھا ہے، اسے مٹا دو تا کہ حجاب برطرف ہو جائے۔''

ابوسعید کے بارے میں ہے کہ وہ اپنے مریدوں سے کہتے تھے:

رأس هذا الامر كبس المحابر و خرق الدفاتر و نسيان العلم

''تصوف کی اساس یہ ہے کہ دوات اور روشنائی کو ایک طرف رکھ دیا جائے اور کتابوں کا پیوں کو پھاڑ دیا جائے اور علم کو بھلا دیا جائے۔'' (اسرار التوحید: ۳۲)

ابوسعید کندی کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ ایک خانقاہ میں درویشوں کے ساتھ رہتے تھے۔ کبھی کبھی چوری چھپے درس میں شرکت کر لیتے تھے۔ ایک دن ان کی جیب سے دوات گر گئی (اور یہ راز فاش ہوگیا) تو ان کے صوفی ساتھیوں میں سے ایک نے کہا: اپنی شرمگاہ چھپالو۔ (نقد العلم والعلماء: ۳۱۷)

اس کے برعکس رسولؐ اللہ کی مشہور و معروف حدیث میں ہے:

وزن مداد العلماء بدماء الشهداء فيرجح مداد العلماء على دماء الشهداء

''قیامت کے دن علماء کے قلم کی روشنائی کو شہداء کے خون سے تولا جائے گا اور وہ شہداء کے خون پر بھاری ہوگی۔''

بہ بین تفاوت راہ از کجاست تابہ کجا

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کہ جب حقائق نا اہل افراد کے ہاتھ میں آ جاتے ہیں تو ان میں کس طرح تحریف کر کے ان سے سوء استفادہ کیا جاتا ہے، کیوان قزوینی المعروف بہ منصور علی شاہ کی ان باتوں پر غور فرمائیے۔ موصوف صوفیاء کے اقطاب میں سے تھے۔

وہ کہتے ہیں کہ قطب کی حدود ان دس معاملات پر پھیلی ہوئی ہے:

۱۔ مجھے بھی وہی باطنی ولایت حاصل ہے جو خاتم الانبیاء کو حاصل تھی............فرق صرف یہ ہے کہ وہ بانی تھے اور میں مروج اور محافظ ہوں۔

۲۔ میں لوگوں کو اس طرح درجۂ کمال تک پہنچا سکتا ہوں کہ برائیوں کی روح کو ان کے بدن میں مار ڈالوں یا ان کے بدن سے نکال کر کفار کے بدن میں منتقل کر دوں۔

۳۔ میں نفس کی قیود سے آزاد ہوں۔

۴۔ مرید اپنے تمام معاملات اور عبادات میری اجازت سے انجام دیں۔

۵۔ میں مریدوں کو جس اسم کا ورد کرنے کا حکم دوں، وہی اللہ کا اسم ہوگا، باقی اسماء کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔

۶۔ دینی معارف اور قلبی عقائد کو اگر میری تصدیق حاصل ہو تو وہ صحیح ہوں گے ورنہ خطا ہوں گے۔

۷۔ میری اطاعت فرض، میری خدمت لازم اور میری حفاظت ضروری ہے۔

۸۔ میں اپنے عقائد میں آزاد ہوں۔

۹۔ میں اپنے مریدوں کے قلبی حالات پر حاضر و ناظر ہوں۔

۱۰۔ میں جنت اور دوزخ کا تقسیم کرنے والا ہوں۔ (استوار نامہ: ۹۵)

یہ باتیں جو ہذیان اور دیوانگی سے زیادہ شباہت رکھتی ہیں، اگرچہ تمام صوفیاء کے ہاں قابل قبول نہ ہوں مگر ان سے یہ

بات واضح ہو جاتی ہے کہ قطب ہونے کے مدعی، قطب کے لیے ان مقامات اور اختیارات کے قائل ہیں جن کا دعویٰ انبیاء نے بھی نہیں کیا تھا۔ یہاں سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ تہذیب اخلاق اور سیر وسلوک میں استاد اور مربی کی ضرورت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے کیسے نتائج رونما ہو سکتے ہیں۔

یہ باتیں جن کا دعویٰ اہل تصوف نے کیا ہے، ان میں سے بعض تو انبیاء سے مخصوص ہیں جبکہ بعض کا دعویٰ انبیاء نے بھی نہیں کیا ہے۔ جو شخص بھی مذہبی مسائل سے تھوڑی بہت آگاہی رکھتا ہو، وہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ کس قدر گہرا المیہ ہے۔ اگر اہل تصوف کی کتب مثلا ''تذکرۃ الاولیاء''، شیخ عطار، تاریخ تصوف، نفحات الانس اور احیاء العلوم کے بعض مباحث کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو اقطاب کے بارے میں ایسے دعوے نظر آتے ہیں کہ انسان وحشت زدہ ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ محققین، متکلمین اور فقہاء نے اس گروہ کے خلاف محاذ قائم کیا جس کی وجہ سے بعض ناآگاہ افراد کو دکھ اور رنج بھی ہوتا ہے۔ لیکن جو لوگ حقائق سے آگاہ ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اگر ان رجحانات کی حوصلہ شکنی نہ کی جائے اور ان کا سدباب نہ کیا جائے تو اسلام کے اصول وفروع کا حلیہ اس طرح بگاڑ کر رکھ دیا جائے گا کہ ان کی اصل شکل پہچانی ہی نہیں جائے گی۔

ہم یہاں پر اخلاقی مسائل کے کلیات کے بارے میں قرآنی آیات کی روشنی میں اپنی اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ اس بحث کی روشنی میں اگلے مباحث کی راہ ہموار ہو جاتی ہے جن میں ایک ایک کر کے تمام اخلاقی فضائل ورذائل پر گفتگو کی جائے گی۔

بارالہا! فضائل اخلاقی کے کمال تک پہنچنا اور تیری بارگاہ کا قرب حاصل کرنا تیری مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ تو اس راہ میں ہماری مدد فرما اور اپنے بندگانِ صالح کے قرب کے مقام تک ہمیں رسائی عطا فرما اور ہمیں صاحب نفس مطمئنہ بنا دے تاکہ ہم ''فادخلی فی عبادی و ادخلی جنتی'' کے خطاب کے مستحق ہو سکیں۔

بارالہا! شیطان کا دام سخت اور سہمگین ہے اور ہوائے نفس ایک خطرناک دشمن ہے، رذائل اخلاقی کانٹوں کی طرح ہماری روح کو تڑپاتے ہیں، ایسے میں صرف تیری مخصوص عنایات ہمیں ان سب سے رہائی دلا سکتی ہیں۔

بارالہا! اس گفتگو کے اختتام پر اس دعا کے ذریعے اپنے آپ کو تیرے سپرد کرتے ہیں:

اللھم لا تکلنی الی نفسی طرفۃ عین ابدا

''پروردگار! مجھے ایک لحظہ کے لیے بھی میرے نفس کے حوالے نہ کر۔''

۞۞۞۞۞